Special Issue Rs.15/-

ایام گم گشتہ کی پچاسویں برسی پر

ہر چہار طرف یہ
ہنگامۂ ہاؤ ہو کیوں برپا ہے ؟
ہندوستانی
مسلمان
آزادی کی پچاسویں برسی پر
کیسا محسوس کرتے ہیں ؟
اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کا
مستقبل
کیا ہے ؟
گزشتہ ۵۰ برسوں میں ہم نے
کیا کھویا ؟ کیا پایا ؟
پچاس سالہ موت زندگی کی یادیں
اہل فکر مسلمانوں کے لیے
ملی ٹائمز کا

خصوصی تحفہ

Australia	A$7.00	China	RB.M 25.0	Hongkong	HK$ 25	Madives	Rf 24.00	Philippines	P 40	Switzerland	Fr 3
Bangladesh	Taka 40	Denmark	D.KR. 26	Indonesia	Rp 6,000	Netherlands	G 5.50	Saudia Arabia	SR 6	Thailand	B 60
Belgium	Fr 135	France	Fr 20	Italy	LIT 6,000	New Zealand	NZ$ 8.50	Singapore	S$ 5	U.A.E	D 6
Brunei	B$ 9.00	Finland	F.MK 20	Korea	W 2,500	Norway	N.KR 20	Sri Lanka	Rs.75	U.K	£ 2.00
Canada	C$ 7.00	Germany	DM 6.00	Malaysia	RM 6.00	Pakistan	Rs 25	Sweden	Kr 25	U.S.A	$ 5.00

احتساب نمبر

اگست ۱۹۹۷ء

اس شمارے میں

ہندوستانی مسلمان: منزل نامعلوم
ہندوستانی مسلمانوں کا نظریاتی انحراف
تین فتوے: ایک سوال
مسلم نسل کشی کے پچاس سال
تحفظ شریعت سے نفاذ شریعت تک
سرکاری ملازمتوں میں مسلمان
مسلمانوں کی مجہول نسل
احتساب
اندرا گاندھی کے دور حکومت میں مسلمان
جمہوریت یا انبوہ گردی
گرد راہ

تصاویر غیرت

گاندھی اور جناح: سکے کے دو رخ
اس کے علاوہ اور بہت سے مستقل کالم

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر

نئی دہلی۔ ۲۵

فون: ۶۸۲۷۰۱۸

فاکس: ۶۹۴۶۶۸۶

سالانہ چندہ: ساٹھ روپے

اداریہ

اللہ ان لوگوں پر رحم فرمائے جو اسی بارے میں شبہہ کرتے ہیں جس کی صداقت پر ان کے قلب مطمئن ہوتے ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں سے ہم مداہنت کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ سچ کو سچ کہنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ رات کو دن کہنے کی ہمیں کچھ ایسی لت پڑ گئی ہے کہ رات کا لفظ ہماری لغت سے یکسر غائب ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی مرد درویش رات کی طرف اشارہ کر دے تو ہمیں اس کی کم علمی اور نادانی پر جھنجھلاہٹ ہوتی ہے آخر یہ اتنی موٹی سی بات کیوں نہیں سمجھ پاتا کہ اب اسی رات کا نام دن پڑ گیا ہے۔ گویا دن دو قسم کے ہیں ایک وہ جس میں سورج چمکتا ہے اور دوسرا وہ جب سورج دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح آزادی کی بھی کئی قسمیں ہیں جس میں سب سے معروف وہ آزادی ہے جس میں سیاسی غلامی اور اذیت ناک محرومی کے احساسات ہر وقت دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔

پچاس سالہ بوڑھی آزادی کے حسن و جمال کا ہر سو چرچا ہے۔ اجنبی افکار و خیالات کو رواج دینے کے لئے اغیار کے سیٹیلائٹ مسلسل ہماری سرحدوں میں اپنی شعائیں پھینک رہے ہیں۔ بلکہ عین ہماری ملی سرحدوں کے اندر اغیار نے اپنے سیٹیلائٹ نصب کر رکھے ہیں کہیں یہ سیٹیلائٹ سیاسی مسلمانوں کی شکل میں ہیں تو کہیں نظام کفر کے ایجنٹ سرکاری علماء نے یہ ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ ان سیارچوں نے عین ہمارے مدار میں اجنبی خیالات کی یورش کر رکھی ہے۔

حالات انتہائی سخت ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ من حیث الامت ہم ایک ایسے جہاز میں سوار ہوں جس کے پچھلے حصے سے دھواں اٹھ رہا ہو۔ زندگی اور موت میں لمحے بھر کا بھی فاصلہ نہ ہو۔ وقت بہت کم ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ٹڈی دلوں کی فوج ہمارے اوپر اتر آئی ہو جو ہر لمحہ ہمارے وجود کو چاٹ رہی ہو۔ جہنم جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں نہ جانے کیوں ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ جگہ یہی ہو جہاں ہم گذشتہ نصف صدی سے رہ رہے ہیں۔ البتہ جب ہم سے یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں تو ہمیں اس آزادی پر بے پناہ پیار آتا ہے۔ ہمارا سارا غم یکلخت کافور ہو جاتا ہے کہ اب ایک اذیت ناک زندگی جینے کے لئے غلام رہنے کی ضرورت بھی نہیں۔

ہمارا غم ایک ایسی امت کا غم ہے جس کا تناظر کھویا گیا ہو۔ ملی ٹائمز کا یہ شمارہ اسی تناظر کی فراہمی کی ایک کوشش ہے۔ ان صفحات میں ہم نے خود کو صرف احتساب تک محدود رکھا ہے۔ اللہ کی توفیق شامل حال رہی تو ہم کسی شمارے کو صرف اس سوال کے لئے مخصوص کریں گے کہ اصلاح احوال کے لئے ہمیں اب کیا اور کیا کرنا ہوگا۔ لیکن کیا ہم اس کے لئے پوری طرح آمادہ ہیں؟

(ادارہ)

الحمد اللہ

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

چند دن قبل سوپر مارکیٹ سے سامان خرید کر باہر نکلتے وقت اچانک نظریں میگزین شیلف پر پڑیں۔ اور دوسرے ہی لمحے ملی ٹائمز اپنے ہاتھوں میں پایا اور زبان سے بے اختیار نکلا "فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے" اس پیارے رسالے کی جتنی تعریف کریں کم ہے۔

ہم یقین نہیں کرسکے کہ یہ وہی ملی ٹائمز ہے جو کچھ دن پہلے ہم بڑے شوق سے پڑھا کرتے اور جو اچانک بغیر کسی اطلاع کے بند ہوا تھا۔ تو ہم نے سمجھا کہ شاید یہ حکومت اور ہندو بنیاد پرستوں کی کارستانی ہے۔ لیکن الحمد اللہ، ملی ٹائمز پھر ایک بار ایک بکھری ہوئی قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑا ہے۔ اللہ رب العزت سے دعاء ہے کہ اللہ آپ کی کوششوں کو کامیاب کرے اور ہم انڈین مسلمان اپنے کھوئے ہوئے منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں بہت فخر ہے کہ ہمارا بھی اپنا ایک رسالہ ہماری اپنی زبان میں موجود ہے۔ جو حقیقت میں بین الاقوامی معیار کا ہے اور ہماری آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان ہے۔ مخلصین۔ شمشیر شیخ۔ وسیم قریشی

جماعت اسلامی

مکرمی ایڈیٹر صاحب السلام علیکم السلام علیکم

ملی ٹائمز ماہ جولائی کے شمارے میں جناب ڈاکٹر شاہد بدر صاحب فلاحی کا مراسلہ نظر سے گذرا جس کے ذریعے جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا محمد شفیع صاحب مونس کا خلافت کے بارے میں اظہار خیال پڑھنے کو ملا

محترم مولانا محمد شفیع مونس صاحب نے جماعت اسلامی کا لبادہ اوڑھ کر فورم برائے تحفظ جمہوریت و سیکولرازم کے اسٹیج پر بیٹھ کر نہیں کھڑے ہو کر جیسا کہ درود و سلام کو کھڑے ہو کر پڑھنے سے اس کی اہمیت و افضلیت بڑھ جاتی ہے اسی طرح کھڑے ہو کر بڑے خلوص و ادب کے ساتھ جن من گن ادھینانک کے گیت گا کر وطن پرستی، جمہوریت نوازی اور سوشلزم دوستی کی جو امیج انہوں نے بنائی ہے خلافت کی تصدیق کرنے کے بعد اس امیج کے بگڑ جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ حالانکہ جماعت اسلامی کا دستور دو ٹوک صاف صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اور نصب العین اقامت دین ہے۔ اقامت دین اور حکومت الہیہ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں حکومت الہی اور خلافت دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں جماعت اسلامی کا بنیادی لٹریچر قرآن و حدیث ہے اور جماعت اسلامی نے دستور میں لکھا ہے کہ قرآن و حدیث اس کی اساس کار ہوگی جماعت اسلامی اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لئے قرآن و سنت ہی کی روشنی میں افراد کی اصلاح، سماج کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کرے گی ریاست کی تشکیل کا دوسرا نام خلافت علی منہاج النبوت ہے اب اگر مولانا خلافت کو جس طرح پرنسپل صاحب اپنے باپ کو نہیں پہچانتے تھے اس کو کیا کہا جائے؟ جماعت اسلامی کے افراد کا حق گوئی دبے باکی امتیازی نشان ہے مولانا موصوف کو جماعت اسلامی امارت کی مقدس کرسی پر بیٹھ کر شہادت حق کے بجائے کتمان حق اور اسلام کے بجائے جاہلیت کی ترجمانی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ابو عمیر۔ بلریا گنج، اعظم گڈھ

خطوط کے کالم

محترمی سلام مسنون

میں نے اشاعت کے کئی خطوط بھیجے جنہیں آپ نے اپریل تا جولائی کے شماروں میں شائع نہیں کیا۔ اس سے مجھے سخت اضطرابی کیفیت محسوس ہوئی۔ اگر ایک صفحہ میں سبھی خطوط شائع نہیں کئے جاسکتے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ دو صفحات اس کے لئے مخصوص کر دیں جیسا ماہنامہ ینگ مسلم ڈائجسٹ، بنگلور کرتا ہے کیوں کہ ہر قاری کے خط میں اہم اصلاحی، فلاحی و تعمیری مشورے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر آپ میرے خطوط شائع نہیں کر سکتے ہیں تو مجھے مطلع کر دیں۔ آئندہ کوئی اشاعتی خط ارسال نہیں کروں گا۔ آپ کا خیر اندیش

محمد علاء الدین، ہزاری باغ، بہار

پتہ بتائیے

جناب ایڈیٹر صاحب قبلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی!

ملی ٹائمز انٹر نیشنل ماہ جون کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ۔ اللہ کرے آپ کا یہ اخبار ملت کے ہر جماعت اور طبقے کے افراد تک پہنچے۔ اخبارات میں اسکول کی طالبہ نصرت جہاں کے بارے میں پڑھ کر بہت تکلیف ہوا کرتی تھی آپ کے اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی اب یہ خط لکھ رہی ہوں برائے مہربانی اس لڑکی کا پتہ معلوم کرائیے ہمارے پاس اس مرض کا بہترین علاج ہے ہماری دعا ہے کہ یہ معصوم بچی جلد از جلد صحت یاب ہو۔ والسلام

فقط شہناز بیگم، میسور، کرناٹک

19/A, 5th Cross, Banni Mantap, Mysore - 15

ہندوستانی مسلمانوں سے شکایت

کشمیر جل رہا ہے۔ یہاں کی ہر گلی اور کوچے میں آگ و آہن اور خاک و خون کا بھیانک اور لرزہ خیز کھیل جاری ہے۔ اب یہ سلسلہ پورے آٹھ سال سے اقوام عالم اور عالم انسانیت کے لئے ایک زبردست چیلنج کی صورت میں عدل و انصاف بانگ رہا ہے۔

یہ ساری صورتحال ملت اسلامیہ ہند کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ پچاس سالہ سیاسی غلامی کے اثرات نے مسلمانان ہند کا جذبہ اخوت و مروت اس حد تک زائل کر کے رکھ دیا ہے کہ امت مسلمہ کے دست و بازو کٹتے دیکھ کر بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ درباری اور سرکاری علماء و مولویوں کی بات ہی کیا، وہ لوگ جو مسلمانان ہند کی سیاسی رہنمائی کے دعویدار ہیں اور د

لوگ بھی جوان کے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لئے تحریک چلانے کا دم بھرتے ہیں۔ جب کشمیر کی لہو لہو کہانی سنتے ہیں تو ان کو جیسے سانپ سونگھ جاتا ہے۔ پچاس سالہ "جمہوری و سیکولر دور" کے سفر میں مسلمانان ہند نے جو کچھ کھویا ہے، اس کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ ملی و قومی شعور ان کے اندر مفقود ہو گیا، جو ایک سچے مسلمان کی پہچان ہے۔ ش۔ جمالی سرینگر

قیمت میں اضافہ کریں

مکرمی ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

الحمد للہ جون کا شمارہ موصول ہوا پڑھ کر بے حد مسرت حاصل ہوئی کچھ حالات آپ کو بتا دوں جس طرح کوئی عاشق اپنے محبوب کی راہ تکتا ہے اسی طرح میرا حال بھی ہے کہ آپ کے ملی ٹائمز کی پہلی تاریخ سے ہی راہ تکنا شروع کر دیتا ہوں مگر راہ تکتے تکتے ۶، تاریخ ہو جاتی ہے۔ اس شمارے میں آپ نے جو قارئین صاحبان سے موضوعات "ہاں" "یا" "نہیں" سے اظہار فراہم کئے ہیں۔ میرے اپنے ذاتی خیال سے اگر وہی موضوعات شائع ہوتے رہیں تو بہتر رہے گا مزید اور موضوعات شائع کریں تاکہ امت مسلمہ کو پوری طرح فیض پہونچے۔ ۵ روپے قیمت کا اخبار بہت ہی مجھے سستا لگتا ہے طباعت اشاعت کے مطابق اس کی قیمت کم سے کم، روپے ہونی چاہیے۔

اگست ۹۰ کے شمارے کو احتساب نمبر کے طور پر شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے مجھے اس شمارے کا شدید انتظار رہے گا۔

فقط آپ کا چھوٹا بھائی

حافظ عبدالرحمان، نواب پورہ، مراد آباد

حسن البنا کی یاد آگئی

برادر کبیر راشد شاذ! سلام عقیدت نیک تمنائیں

ملت کی دردمندی اور مسلمانوں کی ہمدردی کا جو شعلہ آپ کے ذہن و دماغ میں لگا ہوا ہے آپ کی تحریر و تقریر سے بخوبی میں اس تپش کو محسوس کر رہا ہوں اور مجھے بے ساختہ تاریخ کے عظیم محرک و فعال قائد حسن البنا کی یاد آرہی ہے۔ بہر حال اگر یہ تنظیم اپنے اصول و ضوابط پر کارگر رہی تو انشاء اللہ جہاں تک ہو گا جانی مالی اور قلمی تعاون ضرور پیش کرتا رہوں گا۔ تنظیم کا کوئی ترجمان ہو تو اس سے ضرور مطلع فرمائیں تاکہ برابر تحریکی امور سے باخبر ہوتا رہوں فی الحال ذاتی طور پر جناب والا کے پرچوں کے تعاون سے نوجوان طلبہ میں تنظیم کے تعارف کا کام شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ ضرور خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ باقی آپ کے مشوروں کا طالب ہوں۔ امید کے ضرور اپنے حالات اور بہتر مشوروں سے نوازتے رہیں گے فقط السلام۔ عبدالوحید قاسمی

جامعہ قاسم العلوم، چاند گڑھ، کولھاپور

ملی پارلیامنٹ

جناب راشد بھائی صاحب

السلام علیکم

ہم خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتے ہیں عرض یہ ہے کہ ملی ٹائمز کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر دل کی کیا کیفیت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا دل کو سکون ہوا کہ آج بھی امت مسلمہ میں آپ جیسے لوگ موجود ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کر کے ملت کی بقا کی کوشش میں جٹے ہوئے ہیں اور جب تک آپ جیسے لوگ ہیں امت مسلمہ کو کوئی توڑ نہیں سکتا آج بھارت میں مسلمانوں کی جو حالت زار ہے اس کی ذمہ داری مسلم قیادت کے اوپر آتی ہے۔ مسلمانوں کی تباہ حالی کے آدھے ذمہ دار خود مسلمان ہیں دین سے بے رغبتی لہو لعب میں مشغول بس پیسہ کمانے کی دھن گھروں میں جوان بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا اور نئی فلموں پر تبصرے کرنا۔ اور بیٹیوں کو بے پردگی کے ساتھ بازاروں میں گھمانا اور نہ جانے کتنی ایسی برائیاں مسلمانوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ جن کو اللہ تعالی نے مطلق حرام کر دیا ہے مگر دین و آخرت سے بے پروا یہ امت آج اللہ کی رسی کو چھوڑ چکی ہے گمراہ ہو چکی۔ آج وہ امت جس کے پاس دنیا کی سب سے مقدس اور اعلی ترین کتاب ہے اور جس کو دنیا کی قیادت کرنا چاہیے تھا آج غیروں کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئی ہے آج پوری دنیا میں مسلمانوں کا جو حال ہو رہا ہے وہ ہم سے مخفی نہیں ہے مگر ہم مجبور ہیں۔ بے بس ہیں کیوں کہ کوئی ہماری قیادت کرنے والا نہیں ہے۔ ایسے میں آپ نے ملی پارلیامنٹ قائم کر کے ایک جراًت مند اقدام کیا ہے۔ اور آج ہمیں اقدام کی ہی ضرورت ہے نہ کہ دفاع کی۔ ہم جس شہر میں رہتے ہیں اس کا نام بھیونڈی ہے۔ یہ مہاراشٹر میں بمبئی سے پچاس کلومیٹر دور ایک مسلم اکثریت کا شہر ہے۔ یہاں کی مکمل آبادی ۱۵ سے ۲۰ لاکھ ہو گی جس میں ۹۰ فیصد مسلم ہے مگر کوئی مسلمانوں کا ایسا لیڈر نہیں ہے جو انتظامیہ کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے سب کے سب بزدل ہیں اور وقت آنے پر کونوں میں منہ چھپاتے ہیں۔

اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ ہم بھیونڈی والوں کو آپ جیسا جراًت مند نڈر و بے باک لیڈر عطا کرے تاکہ ہم سبھی سر اٹھا کر جی سکیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ ملی پارلیامنٹ کا ایک اجلاس بھیونڈی میں منعقد کریں اور بمبئی مالیگاؤں بھیونڈی میں ملی پارلیامنٹ کی شاخیں قائم کریں اور اس سلسلے میں جو بھی تعاون آپ چاہتے ہیں وہ ہم دینے کو تیار ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ آپ تمام کو ثابت قدم رکھے کہ دین پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ایمان پر خاتمہ کرے اور ملی ٹائمز کی اور ملی پارلیامنٹ کو ترقی عطا فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمان ہماری تحریک میں شامل ہوں۔

شیخ الیاس طاہر، تھانے، مہاراشٹر

سوال میری شادی کا پیغام دینے والے مردوں میں سے ایک سے مجھے محبت ہو گئی اور جب ہمارے زندگی کے بندھن میں ایک ہونے کا موقع آیا تو میرے ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ جس قدر مجھ سے قریب ہو چکا تھا اب میں اتنی ہی اس سے بیزاری محسوس کرنے لگی اور یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے میں اس سے دور اور متنفر ہوتی جارہی ہوں۔ یہ معاملہ دیکھ کر میرے گھر والوں نے شادی مؤخر کر دی۔ میں کوئی بات چھپائے بغیر بتا رہی ہوں کہ ماضی کی ساری محبت اور الفت شدید نفرت میں بدل گئی یہاں تک کہ میں نے گھر والوں کے سامنے شادی میں عدم دلچسپی کا اعلان کر دیا۔ یہ بات تھی ہی سب کو چونکا دینے والی۔ لیکن سب کی امیدوں پر پانی پھیرنے اور اس رشتے کو ٹھکرا نے کے چھ ماہ بعد مجھے اپنے کیے پر حد درجہ ندامت ہوئی اور اس کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں لگی رونے پیٹنے۔ میرے ساتھ کی پڑھی ہوئی ایک لڑکی نے بتایا کہ مجھ پر کسی نے سحر کرادیا ہے اب میں بار بار پچھلے واقعات پر نظر کرتی ہوں تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا جس پر پچھلے رشتے کے ٹوٹنے کا الزام رکھوں آخر خود کو ہی مجرم گردانتی ہوں۔ اب آپ سے رجوع کر رہی ہوں کہ اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب خدا آپ کے حال پر رحم فرمائے۔ پہلی بات تو یہ آپ کو بتادوں کہ جن دو مرد اور عورت کے درمیان شادی کا قول و قرار ہو چکا ہو شرعی ارتباط یعنی نکاح سے پہلے قریب آنا مناسب نہیں۔ یہ بات مسلمان مرد اور عورت کے لئے جائز نہیں ہے چاہے اس قربت سے ان کی نیت رشتہ زوجیت میں بندھنے کی ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے گئے طریقے کے مطابق ایک دوسرے کے لئے جائز ہونے سے پہلے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہی رہتے ہیں۔ میرے خیال سے جو کچھ گزرا ہے اس میں بڑی حد تک آپ دونوں کے اس آزادانہ اختلاط کا بھی ہاتھ ہے۔ اور رشتے سے آپ کا انکار دوسرے فریق پر بھی بہت شاق گزرا ہے کیونکہ اسے بھی آپ سے ایک گونہ تعلق خاطر ہو گیا تھا۔

مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی...

جہاں تک سوال ہے اس محبت سے آپ کی دست برداری کا۔ اس کے التوا یا رشتہ زوجیت میں منسلک ہونے سے آپ کی بے رغبتی کا تو اس کے ممکنہ اسباب دو ہیں۔ ایک وجہ غالباً ہسٹریا کے مرض سے تعلق رکھتی ہے جو زیادہ تر عورتوں کو لاحق ہوتا ہے خاص طور پر بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر۔ یہ مرض کبھی موروثی اثرات کی بناء پر واقع ہوتا ہے جو والدین سے بچوں تک منتقل ہوتے ہیں اور کبھی جغرافیائی اور سماجی حالات بھی اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اس طرح کے انسان کے مزاج میں تیزی سے تغیر آتا رہتا ہے۔ اور کسی بھی حالت پر قرار نہیں رہتا۔ دوسرے کیا کہتے ہیں یا ان کی بات سے کیا تاثر لیتے ہیں اس سے وہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ کسی بات پر ان کا جوش شروع میں تو بے حد و بے حساب ہوتا ہے کسی کے لئے محبت کا سیلاب امڈنے لگے گا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد یہ ساری گرم جوشی بے نیازی اور رنجیدگی میں تبدیل ہو جائے گی پھر اچانک اس ہمدم دیرینہ کی مفارقت کا خیال بھی انہیں ستائے گا۔

رہ گئی یہ بات کہ اس معاملے میں کوئی ایسا شخص جس نے کہ آپ دونوں کے درمیان سحر کے ذریعے جدائی ڈال دی ہے تو یہ محض شبہ ہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب اس سلسلے میں آپ چاہیں تو قرآنی اعمال کے ذریعے شرعی علاج کرنے والے کسی عالم سے رجوع کر سکتی ہیں تاہم یہ بات مدنظر رکھیں ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہئے۔ اور آدمی یہ نہ سوچے کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ یقیناً ایسا نکلا ہوتا بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ اللہ کی طرف سے وہ مقدر میں تھا اور ایسا ہی ہوا۔ آپ نے جو کیفیت اپنی بیان کی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سیمابی کیفیت اور تلون مزاجی کا شکار ہیں جو اپنی جگہ ایک مرض ہے اس سے یہ سبق بھی ملنا چاہئے کہ آئندہ شادی بیاہ کے معاملات طے کرنے میں عقل و شعور سے کام لیا جائے۔ اور یہ سمجھ لیا جائے کہ دوسروں کے ساتھ آپ کے تعلقات میں خوف خدا کا عنصر نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے اور یہ کہ ان کے تئیں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش بھی کریں کیونکہ شیطان بعض لوگوں کے غیر متوازن جذبات سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتا ہے جو انہیں ایسی نوبت کو پہنچا دیتا ہے جس کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے آپ ذکر و استغفار بھی کثرت سے کریں اور یہ دعا پڑھا کریں اللھم الھمنی رشدی واعذنی من شر نفسی۔

سوال میری شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔ ہمارے یہاں ایک بیٹا ہے۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک بڑے سے فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے شوہر سے کہا کہ گھر کے کاموں مثلاً کپڑے دھونے اور جھاڑو برتن کے لئے ایک ملازمہ رکھ دیں جس سے میری مدد ہو جایا کرے گی۔ شوہر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ وہ گھر میں کسی ایسی عورت کو رکھنے کے حق میں نہیں ہیں جس کے ساتھ کوئی محرم نہ ہو۔ میری تمام بہنوں اور رشتہ دار عورتوں کے گھر میں خادمائیں ہیں تقریب کے موقعوں پر وہ مجھے اپنے بچے کو خود گود میں اٹھائے دیکھ کر پوچھتی ہیں کہ میں خادمہ کیوں نہیں رکھ لیتی تو میری بڑی سبکی ہوتی ہے میرے خاوند کو یہ احساس نہیں کہ یہ صورت حال میرے لئے کتنی تکلیف دہ ہوتی ہوگی۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔

جواب روئے زمین پر اللہ تعالی کی واضح نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ بہت سے کام جو انسان اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے اس کے اندر بھلائی اور برائی نفع اور نقصان دونوں یکساں طور پر چھپے ہوئے ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کام کا نتیجہ صرف اچھا نکلے گا اور اسی طرح یہ دعوی بھی ممکن نہیں کہ فلاں کام کا انجام برا ہی ہوگا۔ بلکہ ہوتا ہے یہ کہ کبھی بظاہر کسی خرابی سے اچھائی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی اچھی بات میں برائی کا پہلو نکل آتا ہے۔ آپ کے معاملے میں کچھ ایسی ہی بات ہے اور ظاہر ہے کہ انسان اچھائی کے پہلو کو ہر حال میں ترجیح دیتا ہے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی زندگی کو مزید خوشحال اور پرسکون بنائے

۔اس زمانے میں گھر میں خادمائیں رکھنے کا ایک معقول جواز یہ ہو سکتا ہے کہ گھر بہت بڑا ہو، افراد زیادہ ہوں تو اسی اعتبار سے دھلنے والے کپڑوں اور برتنوں کی تعداد بھی ہوتی ہے اور عام صفائی کا کام بھی بڑھ جاتا ہے زیادہ بچے ہوں اور صاحبہ خانہ بھی ملازم پیشہ ہو تو ضرورت شدید ہو جاتی ہے لیکن خادمہ رکھنے کے لئے آپ کی دلیل میں کوئی جان نہیں نظر آتی ماشاء اللہ آپ نوجوان ہیں ابھی ایک ہی بچہ ہے اور گھر فلیٹ کی شکل میں ہے یعنی بڑا نہیں کہا جاسکتا۔ خادمہ رکھنے پر آپ اپنے شوہر سے صرف اسی وجہ سے اصرار کر رہی ہیں کہ تقریبات میں ملنے جلنے والی رشتے دار عورتوں جن کے ساتھ خادمائیں ہوتی ہیں وہ جب ٹوکتی ہیں تو آپ کو خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ گھر میں خادمہ رکھنے کے ان منفی پہلوؤں پر آپ نے شاید غور نہیں کیا جن کا اثر آپ کی گھریلو زندگی اور صحت پر بھی پڑسکتا ہے۔ آپ کے پاس کرنے کو جب کچھ نہ رہے گا اور گھر میں بھی نقل و حرکت میں کمی واقع ہو جائیگی تو اس سے آپ کے جسم پر سستی طاری ہو جائیگی، موٹاپے کا غلبہ ہو جائے گا اور یہ ذیابطیس اور بلڈ پریشر جیسے امراض کا سبب بنتی ہے، یہ آپ جانتی ہی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ایک نزاکت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ابھی آپ کی شادی کو ہوئے ہی کتنے دن ہیں گھر میں آپ کے شوہر کا دل ہنسنے بولنے کو ضرور چاہتا ہو گا۔ ایک اجنبی عورت کی موجودگی میں پرائیویسی تو حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ نظر کی نہ جانے کیسی ہو اور ڈھائی افراد والے اس گھر میں کیسے کیسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے یہاں تک کہ آپ کے اور شوہر کے درمیان کوئی غلط فہمی پنپنے لگے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شوہر کی آمدنی محدود ہو اور یہ سوچتا ہو کہ خادمہ کو جو رقم دی جائیگی وہ بچے کی بہتر تربیت پر خرچ ہو۔

بچے کی صحت کے عام اصول کے نقطہ نظر سے بھی ایک بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ ملی ٹائمز کے گزشتہ شماروں میں سے کسی میں ہم نے ایک مضمون اسی موضوع پر شائع کیا تھا کہ بچوں کو لگنے والی عام بیماریوں میں سے کئی ایسی ہیں جو زیادہ تر آیاؤں سے منتقل ہوتی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ آیا نہ تو آپ کی طرح صاف ستھری اور باسلیقہ ہو سکتی ہے اور نہ اسے بچے سے وہ تعلق ہو سکتا ہے جو ماں اور باپ کو ہوتا ہے۔ ایسے بھی واقعات ہوئے ہیں کہ بچوں کو گھر سے پارک میں لے جا کر ٹہلانے والی آیاؤں نے مالکان سے کسی بات کا بدلہ لینے کے لئے انہیں کوئی تکلیف پہنچائی یا کوئی خراب چیز کھلائی۔ اگر یہ بات نہ بھی ہو تو بھی اس سوال کی اہمیت کم نہیں ہوتی کہ کیا بچوں کے لئے آیاؤں کی گود ماں کی آغوش سے زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔؟

آپ کے شوہر نے آیا نہ رکھنے کا جو عذر پیش کیا وہ ان کی نیکی اور خدا ترسی اور دور اندیشی کی دلیل ہے جس کی آپ کو قدر کرنی چاہئے۔ جب آپ کسی تقریب میں جائیں تو یہ ضروری نہیں کہ آپ بچے کو گود میں ہی اٹھائیں۔ منے کو باہر لے جانے کے لئے پریمپ میں بٹھائیں یا لٹائیں آپ کی رشتے دار عورتیں آپ کی اس سلیقہ مندی سے متاثر ہوں گی۔ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آیا یا خادمہ کیوں نہیں رکھتیں تو آپ اس کا پورے اعتماد سے یہ جواب دیں کہ اپنے لخت جگر کی کئی درجہ بہتر نگہداشت میں خود کر سکتی ہوں اس سے آپ کی قدر و منزلت شوہر کی نظر میں بڑھے گی۔ ہماری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

سوال میری عمر پچیس سال ہے اور اللہ کے فضل سے میں صلوۃ و صوم کی پابند ہوں۔ پڑھنے لکھنے میں اچھی رہی ہوں۔ خوبصورت بھی ہوں۔ ادھر کچھ دنوں سے مجھے یہ بیماری ہو گئی ہے کہ نیند میں پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ جس سے مجھے بہت الجھن ہوتی ہے کسی اور جگہ جانا ہو تو اس خدشے سے مجھے نیند نہیں آتی چاہے میری خالہ کا ہی گھر کیوں نہ ہو۔ اس بات کا اثر میری نفسیات پر بھی پڑنے لگا ہے۔ مزاج میں سختی اور چڑچڑا پن آگیا ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے اس سے میں بہت خائف رہتی ہوں۔ (حبیبہ خان، حیدر آباد)

جواب اللہ کے بندے طرح طرح کی تکلیفیں اور امراض میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کو جسمانی عارضہ ہے تو کسی کو ذہنی کوئی مفلوج ہے تو کوئی اپاہج اور یہ سب اللہ کی نعمتوں پر صبر و شکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ سے اس مرض کو رفع کرنے کی دعاء کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ کرنا چاہئے کہ کسی ماہر طبیبہ سے رجوع کریں۔ اس کا امکان ہے کہ جسم کے اندر بعض اجزاء کی کمی اور ان کے عدم توازن کی بناء پر یہ بات ہو رہی ہو۔ طبیبہ کو آپ یہ بھی بتائیں کہ نیند آپ کو کیسی آتی ہے یعنی گہری نیند ہوتی ہے یا بار بار اچٹنے والی۔ اس دوران خواب کس طرح کے آتے ہیں۔ بے خوابی یا کم خوابی بھی اس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بارے میں آپ کو بہت خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ شکایت بہت سے لوگوں کو ہوتی ہے اور یہ ایک عارضی دور ہوتا ہے۔ آرام کام اور غذا کے معمولات میں بھی فرق واقع ہونے سے یہ بات کبھی ہو جاتی ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ یہ جسمانی عارضہ کچھ دنوں کے اچھے علاج سے جاتا رہے گا۔ اس دوران آپ اپنی فکر مندی کو کسی حد تک کم کرنے کے لئے ایسا کر سکتی ہیں کہ سوتے وقت روئی یا فوم کا پیڈ لگا ہوا انڈرویر پہن لیا کریں اس سے ایک تو پیشاب کے قطرات سے کپڑے خراب نہیں ہوں گے۔ آپ آرام سے سو بھی سکیں گی۔ اور عبادات میں خلل واقع ہے۔ جو الجھن آپ کو محسوس ہوتی ہو گی وہ بھی بہت کم ہو جائے گی آپ یہ ضرور کر کے دیکھیں۔ □

انا لله وانا الیہ راجعون

ایام گم گشتہ کی پچاسویں برسی پر

اوراق احتساب

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر اب توہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(سورۃ النور: الآیۃ ۵۱)

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے تو انہیں چاہیے کہ جب انہیں اپنے معاملات فیصل کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تو وہ برملا کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور ایسے ہی لوگ دراصل فلاح پانے والے ہیں (النور: ۵۱)

ہندوستانی مسلمان: منزل نامعلوم

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسا لگا جیسے یہ سورج اس سورج سے مختلف ہو جس کے طلوع کی انہیں برسہا برس سے توقع تھی اور جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائی جھونک دی تھی۔ نیا ہندوستان اب ایک منقسم ہندوستان تھا جس میں مسلمانوں کی عددی قوت تین حصوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ ملک کے بے شمار سیاستدانوں کے لئے ۱۵ اگست بے شمار کامیابیوں کا نقطہ عروج تھا، اگر ایک طرف جواہر لال نہرو کی دیرینہ آرزو وزارت عظمیٰ کی شکل میں پوری ہو رہی تھی تو دوسری طرف محمد علی جناح بھی نو تشکیل یافتہ مملکت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ جناح ہوں یا نہرو ان دونوں کے لئے آزادی کی نئی صبح یقیناً جشن کا دن تھا لیکن آزاد اور گاندھی کو اپنا خواب کسی حد تک بکھرتا دکھائی دیتا تھا۔ گاندھی کے ہاتھ میں پھر بھی شاہ کلید تھی کہ وہ اپنی زبردست عوامی مقبولیت کے باعث جب چاہیں مرن برت کی دھمکی دے کر نئے ہندوستان کے خواب کو اب بھی کسی حد تک اپنی مٹھی میں رکھ سکتے تھے البتہ آزاد کا غم ایک ایسے شخص کا غم تھا جس کی کشتی طوفان نے تباہ کر دی ہو اور جسے بھنور سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

منقسم ہندوستان میں مسلم سیاست کو اب ایک نیا مرحلہ درپیش تھا تقسیم نے صورت حال یکسر بدل کر رکھ دی تھی آخر آخر تک آزاد کو یہ امید تھی کہ ہندوستان کی ایک غیر فطری جغرافیائی تقسیم ممکن نہ ہوگی۔ پھر ابتداء میں پاکستان کے فلسفہ سازوں نے متحدہ ہند میں چھوٹے چھوٹے مسلم تہذیبی وفاق کا خواب دیکھا تھا جس نے جناح کی قیادت میں ایک علیحدہ ملک کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزاد کو اس بات کا یقین تھا کہ اس ملک پر ہزار سالہ حکمرانی کرنے والی امت شمالی ہند کے اہم مراکز، دہلی اور آگرہ کی سیاسی تاریخی جاہ و حشمت کو خیر باد کہہ کر کسی اور طرف ہجرت نہیں کر پائے گی انہیں اپنے قریبی کانگریسی رفقاء اور بالخصوص گاندھی جی جن کے لئے متحدہ ہندوستان ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا، پر بھرپور اعتماد تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم جیسے فیصلے کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ انہیں اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبوں کو کسی حد تک تسلیم بھی کر لیا گیا تو متحدہ ہندوستان میں ان کی مرکزی حیثیت مجروح نہ ہوگی اور آنے والے دنوں میں ان کے لئے امام الہند کی حیثیت مزید اعتبار حاصل کرلے گی۔ آزاد کو اس بات کا بھی خوب اندازہ تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت جن لوگوں پر مشتمل ہے وہ کسی عظیم مقصد کے لئے معمولی سی قربانی دینے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر مطالبہ پاکستان کی تحریک اور اس کی قیادت کسی واقعی آزمائش سے دوچار ہوتی ہے تو جناح کے ارد گرد جمع ہونے والے لوگ جلد ہی منتشر ہو جائیں گے۔ لیکن جناح کی زبردست قوت ارادی نے ان کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت کر دیا اور انہیں سب سے بڑا دھچکا اس وقت لگا جب پٹیل اور نہرو تو کجا خود گاندھی جی نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ تب آزاد کو ایسا لگا جیسے ان کے قدموں سے زمین نکل گئی ہو، ان کے پاس کوئی سہارا نہ رہا جس پر وہ ٹیک لگاتے۔ منقسم ہندوستان کے نئے نقشے میں اگر ایک طرف جناح کو بانیٔ ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی تو دوسری طرف نہرو کو آزاد ہندوستان کے نئے معمار کی حیثیت سے سامنے آنے کا موقع مل رہا تھا۔ آزاد جو ہمیشہ سے سیاست میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے تھے اور جنہیں متواتر کانگریس کی قیادت کا موقع ملتا رہا تھا قوت کے نئے میزانیے میں اب ان کا Relevance بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔

منقسم ہندوستان میں جب کانگریس کے دوسرے قائدین کے لئے جشن و طرب کا خاصا جواز تھا جب پٹیل کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کا ملک محض انگریزوں کی نوے سالہ غلامی سے آزاد نہیں ہوا بلکہ صدیوں کی سیاسی غلامی سے اسے نجات ملی ہے تب دور بہت دور تن تنہا گوشہ تنہائی میں

مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسا لگا جیسے اسلاف کی اس دلی پر عظمت رفتہ کا سورج شاید اب کبھی طلوع نہ ہو سکے گا۔ عظمت رفتہ کا یہ خواب اور سخت مایوسی میں امیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش بالاخر خطابت کے قالب میں ڈھل گئی جسے جامع مسجد کی تاریخی معرکہ الآرا تقریر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

آزاد کا یہ غم ذاتی سطح پر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو انہیں نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دینا تھا البتہ ایک ایسے شخص کے لئے جس کی ساری ترکیبیں ناکام ہو گئی ہوں۔ اندازے الٹ پلٹ گئے ہوں اور جسے ایسا لگا ہو جیسے اب اس اندھیرے سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ ملنا مشکل ہے اس کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ وہ اب عمر کے اس مرحلے میں کسی نئے طریقہ سفر کا ڈول ڈالتا۔ دیکھا جائے تو نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل بالکل ابتدائی دنوں سے ایک بے یقینی اور بے سمتی کا شکار رہی۔ جائیں تو جائیں کہاں؟ سیاسی سفر کی حتمی منزل کیا ہونی چاہیئے؟ ہم اس ملک میں سیاسی طور پر کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ایک شکست خوردہ سپاہی کے لئے کسی ایسے سوال کا واضح جواب فراہم کرنا ممکن نہ تھا جو نئی سمت میں سفر کی دعوت دینا ہو تب سے اب تک اس ملک میں ہمارا سیاسی قافلہ ان بنیادی سوالات کے واضح جوابات دریافت نہیں کر پایا ہے۔ گویا جس بے سمتی میں نئے ہندوستان کے مسلمان آج سے پچاس سال پہلے مبتلا تھے آج بھی وہ کم و بیش وہیں نظر آتے ہیں۔ یقینا گذشتہ نصف صدی میں مسلمانوں نے سیاست میں چلت پھرت جاری رکھی ہے ہمارا سیاسی قافلہ کلی طور پر جمود کا شکار نہیں رہا ہے۔ لیکن کسی واضح سمت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم بار بار اس دائرے میں گھومتے رہے اور اسی نقطے پر پہنچتے رہے جہاں سے کبھی سفر کا آغاز ہوا تھا۔ آج جب اس سفر کو پچاس برس پورے ہو چکے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی سابقہ پیش رفت یا بے سمتی کا انتہائی معروضی انداز سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی میں اگر قافلے کے رہنماؤں سے بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں ہوئی ہیں تو اس کا تدارک اب کیسے کیا جائے؟ محض کسی شخص، گروہ یا رہنما کو مورد الزام ٹھہرانے سے مسئلہ حل ہوگا اور نہ ہی ماضی کی شخصیات کی تقدیس کا نغمہ گانے سے مستقبل کے لئے کوئی راستہ نکل سکے گا۔

انگریزوں کی نوے سالہ غلامی سے آزاد نہیں ہوا بلکہ صدیوں کی سیاسی غلامی سے اسے نجات ملی ہے تب دور بہت دور تن تنہا گوشہ تنہائی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسا لگا جیسے اسلاف کی اس دلی پر عظمت رفتہ کا سورج شاید اب کبھی طلوع نہ ہو سکے گا

اپنی بساط بھر ابوالکلام آزاد نئی صورت حال میں ہندوستانی مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کے لئے جو کچھ ممکن تھا کرتے رہے وہ ایک شکست خوردہ سپاہی ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالا۔ البتہ تھے وہ بہر حال انسان جسے قریب ترین رفقاء کی بے وفائی کا داغ لگا تھا۔ مایوسی اور ناکامیوں نے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ اپنی بہت کچھ کوششوں کے باوجود وہ ایک بالکل تازہ دم سپاہی کی طرح نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے۔ کہ وہ بہر حال انسان تھے اور ہر انسان کی خواہ وہ کتنی ہی غیر معمولی صلاحیت کا حامل کیوں نہ ہو اس کی Limitations تو بہر حال ہوتی ہیں۔ ان کے ہر صحیح اور غلط اجتہاد کے لے اللہ کے یہاں اجر موجود ہے۔ البتہ ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ نئے سفر کی نئی ابتداء جسے کسی وجہ سے مولانا آزاد انجام نہ دے سکے اب ہم اس سمت میں ایک منصوبہ بند پیش قدمی کا آغاز کیسے کریں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم سفر کا آغاز کریں بہتر ہوگا کہ گزشتہ پچاس سالہ سیاسی سفر کا ایک ناقدانہ جائزہ لیں اور ان وجوہات کا پتہ چلانے کی کوشش کریں جس کی وجہ سے ہمارے متقدمین صحیح سمت میں نئے سفر کا آغاز نہیں کر پائے۔ گویا ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ ہم اپنے بزرگوں کے کامیاب اور ناکام تجربوں سے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں پھر اگر اس مرحلے میں بعض بنیادی غلطیوں کا پتہ لگایا جا سکا تو ہمارے لئے ممکن ہوگا کہ ہم مستقبل میں ان غلطیوں سے اپنا دامن بچا سکیں۔

تقسیم کے فوراً بعد ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی قیادت کے لئے بنیادی طور پر جو چند لوگ یا گروہ میسر آئے ان میں ابوالکلام آزاد کا مقام

آج جب اس سفر کو پچاس برس پورے ہو چکے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی سابقہ پیش رفت یا بے سمتی کا انتہائی معروضی انداز سے جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ماضی میں اگر قافلے کے رہنماؤں سے بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں ہوئی ہیں تو اس کا تدارک اب کیسے کیا جائے؟

سب سے نمایاں تھا بیشتر مسلمان جو جناح کی سیاسی قیادت کے اسیر تھے وہ پاکستان منتقل ہو رہے تھے بعض مسلم لیگیوں نے اب نئے حالات میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ گو کہ جنوب میں مسلم لیگ کے بعض حلقے اب بھی لیگی سیاست کو نیا روپ دینے میں مصروف تھے لیکن یہ حلقہ بہت مختصر تھا پھر چونکہ مسلم لیگ کی ہوا منقسم ہندوستان میں اکھڑ گئی تھی اس لئے ہندوستانی مسلمان اب اگر سیاسی رہنمائی کے لئے کسی طرف دیکھتے تھے تو وہ بنیادی طور پر ابوالکلام آزاد کی ذات تھی۔ آزاد کے ارد گرد نیشنلسٹ مسلمانوں اور جمعیۃ العلمائی مولویوں کا بھی ایک حلقہ تھا جن میں بعض سر بر آوردہ شخصیتیں بھی موجود تھیں لیکن سیاسی اعتبار سے ان کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی بلکہ یہ سب سیاسی رہنمائی کے لئے آزاد کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی حلقوں میں مولوی حسین احمد مدنی کے گہرے اثر و رسوخ کی وجہ سے اور پھر ان کی سابقہ سیاسی سرگرمیوں کے باعث بھی رہنمائی کے لئے مسلمانوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھتی تھیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے دیوبندی علماء ہوں یا جمعیۃ العلماء سے متعلق افراد ان سبھوں کی حیثیت آزاد کے تتمہ Extension سے زیادہ نہ تھی جو متفقہ طور پر کم از کم القاب و آداب کی حد تک تو ابوالکلام آزاد کو امام الہند تسلیم کرتے ہی تھے۔ گویا نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا کام کلی طور پر آزاد کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ آزاد اور ان کے حلقہ احباب کے لئے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ نئے ہندوستان میں ان کا سیاسی فلسفہ پوری طرح IRRELEVANT ہو چکا تھا بالکل نئے راستے پر قافلے کو لے چلنے میں یہ خطرہ تھا کہ انہیں اپنے سابقہ سیاسی نظریات کو یکسر مسترد کرنا پڑتا۔ ایسا کئے بغیر نئے لائحہ عمل کی ترتیب مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ آگے چل کر سید محمود نے کسی حد تک سابقہ جامد سیاسی تصورات سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی البتہ وہ کوئی واضح راستہ بنانے میں ناکام رہے۔ آیئے دیکھیں کہ نئے ہندوستان میں سیاسی قائدین کی پہلی نسل کو فکری اور نظریاتی سطح پر کن سوالوں سے الجھنا پڑا۔
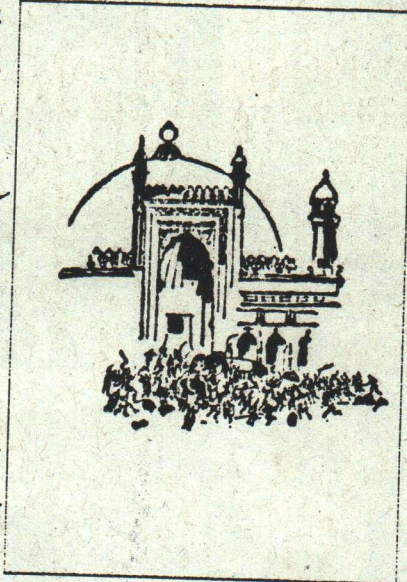
منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے اب تین راستے تھے اولا متحدہ قومیت کے جس راستے پر وہ اب تک گامزن تھے اور ملک کی سیاست میں غیر مسلموں کے اشتراک سے جو رول ادا کرنا چاہتے تھے اسی سابقہ رویے پر گامزن رہیں۔ ثانیا، صورت حال کے یکسر بدل جانے سے اب جب سابقہ سیاسی رویے کی فرسودگی پوری طرح واضح ہو چکی تھی اس رویے کو یکسر ٹھکرا کر ایک نئے رویے کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ثالثا، متحدہ قومیت کا انکار یا اقرار کئے بغیر اب نئی صورت حال کے پیش نظر کتاب و سنت کی رہنمائی میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے لیکن ایسا کرنے میں بھی اپنی ناکامی کا اعتراف اور سابقہ سیاسی رویے سے اپنی براءت کا اظہار کرنا پڑتا۔ پھر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جان و مال کو جو سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ہر طرف جس بڑے پیمانے پر قتل عام کا بازار سجایا جا رہا تھا اس نے قائدین کو کسی نئی ابتداء کے بجائے ایک ایسے عمل پر مجبور کر دیا جس کا ماحصل صرف اور صرف یہ تھا کہ اس ملک میں زندگی کی امان پانے کے لئے کچھ جواز فراہم ہو جائے۔ لہذا ابتدائی دنوں میں ہماری سیاسی رہنمائی بنیادی سوالوں سے بڑی حد تک اپنا دامن بچائے رہی۔ لکھنؤ کنونشن جسے نئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مسلمانوں کے پہلے سیاسی اجتماع کی حیثیت حاصل ہے وہاں اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا کہ چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کیا گیا کہ مسلمان اس ملک کے وفادار ہیں لہذا اپنی اس وفاداری اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی خدمات کے طفیل انہیں بھی زندگی جینے کا حق دیدیا جائے۔ جمعیۃ العلماء کے ایک سرکردہ عالم مولانا حفظ الرحمن نے اپنی وفاداری کا اعلان کچھ اس طرح کیا:

"بے شک ہم وفادار ہیں مگر صرف مادر وطن کے وفادار ہیں۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو اور مسلمانوں کے لئے برابر ہو۔ میں کہتا ہوں کانگریس میں شرکت کرو کیونکہ اس

سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لئے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ تمہاری شرکت ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

(الجمعیۃ، قومی اتحاد کانفرنس نمبر ص ۲۲)

مولانا آزاد جنہیں اب تک ہندوستانی مسلمانوں سے شکایت تھی کہ انہوں نے متحدہ قومیت کے نعرے پر کھلے دل سے ان کا ساتھ نہیں دیا ہے اور جو نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی امید کا واحد مرکز بن گئے تھے انہوں نے اس کانفرنس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مسلمان اب نئی صورت حال میں کھلے دل سے ان کا ساتھ دیں، مشترکہ سیاست میں حصہ لیں اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا اور وطن کا ہاتھ بٹائیں۔ البتہ نئے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہو گا اس بارے میں مایوسی، خوف اور اندیشے ان کے دل و دماغ پر بری طرح طاری تھے۔ اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر تو دور کی بات اب تو انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے قریبی رفقاء اور ان کی نئی حکومت مسلمانوں سے ان کی اسلامی شناخت چھین لینے کے درپے ہے۔ مولانا کی یہی مایوسی اور خوف خطابت میں کچھ اس طرح ڈھل گئی:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں" (ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، فرقہ واریت مخالف کنونشن نمبر ص ۴۵)

لکھنؤ کانفرنس نئے ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی نئے سیاسی رویے کی داغ بیل نہ ڈال سکی، اس وقت جو مسئلہ سب سے اہم تھا وہ یہ کہ کسی طرح مسلمانوں کی جان و مال بچا لی جائے، ان کا کھویا ہوا حوصلہ بحال ہو اور حکومت وقت کو یہ یقین دلایا جائے کہ ملک کے ۴ کروڑ مسلمان وفاداری میں دوسرے اہل وطن سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ اب ان کا مفاد اس ملک کے مفاد سے وابستہ ہے اگر وہ اس ملک میں اپنا کوئی مستقبل دیکھتے ہیں تو یہ دوسری اقوام کے مستقبل سے مختلف کوئی مستقبل نہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ملی مفاد بھی تقسیم ہو چکا ہے

اور امت مسلمہ کا وہ حصہ جو ہماری جغرافیائی سرحدوں سے باہر ہے ہندوستانی مسلمان ان کے مسائل اور مفادات سے بھی کچھ غرض نہیں رکھتے۔ انہی دنوں علمائے ہند کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی تقریر میں اس نکتے کی وضاحت کچھ اس طرح کی:

"تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کر دیئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے مفید ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں۔ ہم پر انڈین یونین ۴ کروڑ مسلمانوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہمیں ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے جس قدر اس پر صحیح طور سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے اسی قدر وطن عزیز کے بہترین بہادر محافظ اور اس کے اہم ترین جز ثابت ہوں گے۔ (الحرم میرٹھ۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نمبر ص ۱۱۴)
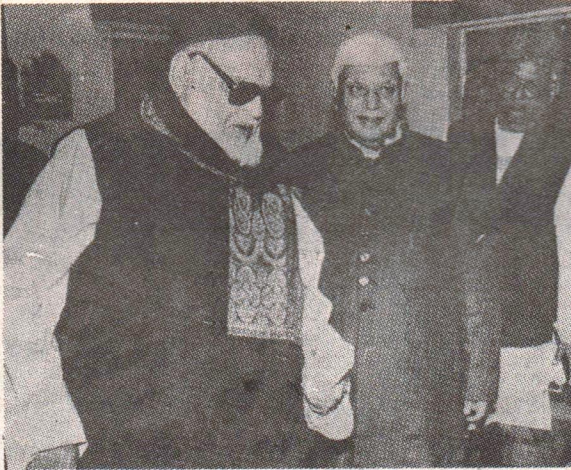
گویا سیاسی رہنماؤں کی پہلی نسل نے مسلمانوں کو جس راہ پر لے چلنے کی کوشش کی اس میں اسی بات پر زور تھا کہ وطن عزیز کے لئے بہترین اور بہادر محافظ کا کام ان سے لیا جائے۔ ان کے اندر وطن پرستی اور وطن کی خدمت کا جذبہ بیدار کیا جائے تاکہ پاکستان

تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جان و مال کو جو سخت خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ہر طرف جس بڑے پیمانے پر قتل عام کا بازار سجایا جا رہا تھا اس نے قائدین کو کسی نئی ابتداء کے بجائے ایک ایسے عمل پر مجبور کیا جس کا ماحصل صرف اور صرف یہ تھا کہ اس ملک میں زندگی کی امان پانے کے لئے کچھ جواز فراہم ہو جائے۔

کے بننے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دامن پر جو داغ لگا تھا اسے کسی حد تک دھویا جا سکے۔ دیکھا جائے تو پہلے دور کی سیاست بڑی حد تک اسی Guilt Complex کی مرہون منت ہے۔ ساری کوشش اس بات کی

ہو رہی ہے کہ ہم پر وطن سے بے وفائی کا جو الزام ہے، ایک علاحدہ شناخت اور علاحدہ قومیت کے قیام کا جو الزام ہے، اسے کسی طرح دھویا جاسکے۔ ظاہر ہے کسی ایسی مجروح ذہنیت کو باحوصلہ اور بالغ نظر قیادت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ متحدہ قومیت کے تلخ نتائج کے سامنے آجانے کے باوجود آزاد اور ان کے رفقاء کے لئے کسی نئے راستے کی نشاندہی کا کام مشکل رہا۔ رہے یہ سوالات کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہوگی؟ وہ اس ملک اپنے لئے کون سا سیاسی نظام پسند کرتے ہیں؟ اور کسی ایسی سیاسی منزل کے حصول کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا؟ تو ان سوالات کا وقتاً فوقتاً اجمالی جواب فراہم کرنے کی کوشش تو کی گئی لیکن جس انداز سے ان اہم بنیادی سوالوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی اس نے مسئلے کو نظری طور پر سلجھانے کے بجائے مزید الجھادیا۔

آزاد نے تو اپنے کیریر کا آغاز ہی حزب اللہ جیسی انقلابی تنظیم کے خدو خال مرتب کرنے سے کیا تھا۔ سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب سے وہ زندگی بھر اپنا پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اور مولانا مدنی ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے اہم دینی درسگاہ کے سربراہ تھے انہیں ایک سیاسی Visionary کی حیثیت حاصل نہ بھی ہو جب بھی درس و ارشاد کے حوالے سے وہ داعی تو غلبہ اسلام کے ہی تھے۔

آزاد ہوں یا مدنی یہ دونوں حضرات عام سیاسی لوگ نہ تھے بلکہ ان کی دین اور اس کے مطالب پر بھی گہری نظر تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان میں ان کے کرنے کا کام کیا ہے۔ بلکہ آزاد نے تو اپنے کیریر کا آغاز ہی حزب اللہ جیسی انقلابی تنظیم کے خدو خال مرتب کرنے سے کیا تھا۔ سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب سے وہ زندگی بھر اپنا پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اور مولانا مدنی ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے اہم دینی درسگاہ کے سربراہ تھے انہیں ایک سیاسی Visionary کی حیثیت حاصل نہ بھی ہو جب بھی درس و ارشاد کے حوالے سے وہ داعی تو غلبہ اسلام کے ہی تھے۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل متعین کرنے کا سوال جب بھی آیا ان حضرات نے اشارہ اسلام اور اسلامی اقدار کے غلبے کی طرف ہی کیا البتہ راستے کی یہ نشاندہی اتنی مبہم، مجمل اور غیر واضح تھی جس سے کسی واقعی سمت کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ واضح طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات وطن عزیز کی وفاداری اور اللہ کی وفاداری کے درمیان ایک کشمکش سے دوچار ہوں، ایک طرف تو ان کے ذہنوں پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا خواب

چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف خود ساختہ سیاسی نظریات بالکل مخالف سمت میں ان کے قدموں کو لئے چلتے تھے۔ اس کشمکش نے آزاد کو آنے والے دنوں میں سخت قنوطیت، مایوسی اور احساس شکست سے دوچار کر دیا اور حسین احمد مدنی سیاست کے میدان سے بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کر کے درس و ارشاد اور گوشہ نشینی پر مجبور ہوگئے۔ ان بزرگوں کے دل و دماغ میں خواب اور عمل کی کشمکش کس شدت کے ساتھ برپا تھی اس کا کچھ اندازہ حسین احمد مدنی کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے نئے ہندوستان میں اسلام کے روشن مستقبل کے سلسلے میں کی تھی:

"عام شہری کی زندگی میں جو تلخی اس وقت موجود ہے وہ عارضی ہے، یقین ہے کہ جلدی ہی یہ تلخی خوش گوار تعلقات کی شیرینی سے بدل جائے گی۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار اور روشن ہو تو ان کا فرض ہے کہ اپنے عمل و کردار سے اپنی اہمیت و افادیت ثابت کریں۔ انڈین یونین کے لئے وہ جس قدر زیادہ مفید ثابت ہوں گے اتنی ہی ان کی عزت و وقعت ہوگی۔ جمہوری نظام حکومت میں نسل مذہب خاندان ترقی کا مدار نہیں ہوتا بلکہ خدمت و قابلیت معیار ترقی ہوا کرتی ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ اور بہترین قابلیت پیدا کریں۔ لامحالہ کامیابی و کامرانی ان کے ہم

سید محمود کو یہ احساس ستائے دیتا تھا کہ آخر مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے باوجود اپنے آپ کو روایتی طور پر اس کا خادم کیوں گردانتے ہیں۔ اگر ملک میں دوسری سیاسی قومیں نئے نعروں کے ساتھ سامنے آرہی ہیں تو مسلمان ان کی حمایت کیوں نہ کریں۔

آغوش ہوگی۔" (الجرم میرٹھ، حضرت مدنی نمبر ص ۱۱۴)

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک ملک بھر میں منعقد ہونے والے سیاسی اور غیر سیاسی اجلاس میں جو گفتگو سننے کو ملتی ہے اس میں کم و بیش اسی قسم کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ کیسے پیدا ہوگا اور خود "خدمت" سے دراصل کون سی خدمت مراد ہے اور یہ سب کچھ کس "شاندار" اور "روشن مستقبل" کی طرف لے جائے گا اس کی تفصیلات سے یا تو دانستہ دامن بچانے کی کوشش کی گئی یا ان حضرات کے ذہنوں میں سرے سے کوئی واضح خاکہ موجود نہ تھا۔ لکھنؤ کنونشن سے بلند ہونے والی آواز نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جس سیاسی راستے کی نشاندہی کی تھی اسے مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ ملک اور ملت کے مفاد میں کوئی فرق نہیں ہے لہذا مسلمانوں کو ملک و ملت کے مفاد میں کام کرنا چاہیے۔

(۲) مشترکہ سیاست کو واحد سیاسی لائحہ عمل کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی منشور کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اب اگر اس ملک میں کوئی سیاسی جدوجہد ہوسکتی تھی تو غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر ہی۔

(۳) ہندوستانی مسلمانوں کا مفاد اب جغرافیائی حدود میں محدود تھا اور جو کچھ ان کے حق میں مفید ہوسکتا تھا بعینہ یہی چیز ہندوستان کے باہر مسلم قوم کے لئے مضر ہوسکتی تھی۔ لہذا ہندوستانی مسلمانوں کو صرف اپنے مسائل سے غرض رکھنی تھی۔ عالم گیر امت کے مفاد کے تصور پر اب متحدہ قومیت غالب آچکی تھی۔

(۴) یہ بات تسلیم کرلی گئی تھی کہ نظام حکومت اب لبرل ڈیموکریسی کے اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔ جس میں سیکولرزم کو ایک بنیادی نظری فلسفے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اب مسلمانوں کو اسی نظام کے اندر رہتے ہوئے اپنا راستہ بنانا تھا۔

(۵) یہ بات بھی تسلیم کرلی گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی بھی خواب دوسری ہم قوموں کے مستقبل سے جدا نہ ہوگا۔ نئے ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے گویا ہندوستانی مسلمانوں کی Destiny (قسمت) اب ملک کی قسمت سے وابستہ ہوگی۔

ان بنیادی اصولوں کے تعین کے بعد لکھنؤ کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ اب اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی علاحدہ سیاسی پارٹی یا علاحدہ سیاسی فکر نہیں ہوگی لہذا جمعیۃ العلماء جسے اب تک قوم پرست مسلمانوں کے سیاسی جرگے کی حیثیت حاصل تھی اسے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے تحلیل کر دیا گیا، اور اس کا کام صرف یہ قرار پایا کہ وہ دینی اور ثقافتی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی تک خود کو محدود رکھے۔ البتہ اگر جمعیۃ کے افراد انفرادی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیں تو وہ کانگریس کے بینر تلے میدان میں آئیں۔ ان اعلانات سے تقسیم آزادی کا داغ مسلمانوں کے دامن سے شاید کسی حد تک دھل گیا ہو اور کسی حد تک متعصب ہندوؤں کی نظروں میں بھی مسلمانوں کا اعتبار قائم ہو گیا ہو البتہ ان اعلانات نے آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے سیاسی عزائم پر مہر لگادی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا خود کانگریسی حلقے کے مسلمانوں کو ایسا لگا جیسے لکھنؤ کانفرنس نے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہوں۔ ۱۹۶۳ء میں اسی احساس کی شدت نے سید محمود کو روایتی سیاست سے بغاوت پر آمادہ کیا۔

جمعیۃ العلماء جسے اب تک قوم پرست مسلمانوں کے سیاسی جرگے کی حیثیت حاصل تھی اسے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے تحلیل کر دیا گیا، اور اس کا کام صرف یہ قرار پایا کہ وہ دینی اور ثقافتی مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی تک خود کو محدود رکھے۔

سید محمود کو یہ احساس ستائے دیتا تھا کہ آخر مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے باوجود اپنے آپ کو روایتی طور پر اس کا خادم کیوں گردانتے ہیں۔ اگر ملک میں دوسری سیاسی قومیں نئے نعروں کے ساتھ سامنے آرہی ہیں تو مسلمان ان کی حمایت کیوں نہ کریں۔ گویا ایک سابقہ سیاسی رویے میں تبدیلی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ سید محمود پر یہ بات بھی واضح ہو چکی تھی کہ اس ملک میں کانگریسی مسلمانوں کے علاوہ

دوسری ملی اور دینی جماعتیں بھی سرگرم عمل ہیں جو امت کے احیاء اور اس کی سر بلندی کے لئے بھلا برا کچھ نہ کچھ پروگرام رکھتی ہیں۔ پھر کیوں نہ ان گروہوں اور جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے کہ کانگریس کے مکار سیاستدانوں کے مقابلے میں تو بہر حال یہ جماعتیں زیادہ قابل اعتبار تھیں۔ اور امت کے تئیں انکی وابستگی شکوک و شبہات سے بالاتر تھی۔ لہذا پہلی مرتبہ نئے ہندوستان میں مسلم سیاست کانگریس سے الگ ہو کر ملی دھارے میں شامل ہو گئی۔ سید محمود نے معروف شخصیات، علماء اور سیاستدانوں کے علاوہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو بھی مل بیٹھنے اور مشترکہ ملی لائحہ عمل تیار کرنے کی دعوت دی تھی۔ کہنے کو یہ فی نفسہ ایک بڑا قدم تھا جس سے کانگریس کے حلقوں میں سید محمود کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا لیکن اپنے اہداف میں نو تشکیل شدہ مسلم مجلس مشاورت سابقہ سیاسی رویے کا ہی تتمہ تھی۔ جس کا مقصد کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل نہیں بلکہ موجودہ نظام کے اندر ہی مسلمانوں کے اتحاد کے ذریعہ ان کی سیاسی قیمت میں کچھ اضافہ کر دینا تھا۔ مختلف سیاسی پارٹیوں تک سفارتیں پہنچائی گئیں اور کچھ لے دے کر مسلم ووٹوں کے عوض ملی مفادات کے حصول کی کوشش جاری رہی۔ لیکن عملی طور پر نہ تو سید محمود کسی نئے تجربے کے موڈ میں تھے اور نہ ہی اس کنونشن سے کسی واضح سیاسی راستے کی نشاندہی ہو سکی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے باحوصلہ افراد میں آزادانہ سیاست کا امکان روشن ہو گیا۔ اسی تجربے سے حوصلہ پا کر آنے والے دنوں میں ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی نے مسلم مجلس کا ڈول ڈالا۔ جس کے حیرت انگیز نتائج نے محدود وقفے کے لئے ہی سہی امکانات اور امیدوں کے بند دروازے کھول دیئے۔

۴۷ء کی لکھنؤ کانفرنس سے لے کر ۶۴ء کے لکھنؤ کنونشن تک ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی سفر جن بنیادی اصولوں پر جاری رہا اسے کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ کانفرنس ۱۹۴۷ء زیر صدارت مولانا آزاد	لکھنؤ کانفرنس ۱۹۶۴ء زیر صدارت سید محمود
(۱) کانگریس مسلمانوں کی جان و مال کی محافظ ہے اس لئے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئے۔	(۱) مسلمان کانگریس کے ہاتھوں پریشان ہو چکے ہیں اس لئے دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی آزمانا چاہئے۔
(۲) ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کرنی چاہئے۔	(۲) ملک کی سیاست میں مسلمانوں کو مؤثر بنانے کے لئے مسلم گروہوں اور جماعتوں کا اتحاد ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے متحدہ ووٹ کے ذریعہ کسی سیاسی پارٹی سے معاملہ کر سکیں۔
(۳) سیکولر جمہوری نظام میں خدمت کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی حیثیت منوانی چاہئے۔ اور اسی نظام کے اندر اپنی ترقی کا راستہ ڈھونڈنا چاہئے۔	(۳) مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ مل کر دستور کے جمہوری اقدار کے نفاذ کی سبیل پیدا کرنی چاہئے۔
(۴) مسلمانوں کو ملک کی ترقی کے لئے دوسروں سے کہیں بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنی چاہئے اس لئے کہ یہ ملک اتنا ہی ہمارا بھی ہے جتنا دوسری قوموں کا۔	(۴) مسلمانوں کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ملک کی ثقافتی، سماجی، معاشی، اور سیاسی ترقی کے دھارے سے دور نہ ہو جائیں اور ملک کی ترقی میں بھرپور رول ادا کریں۔
(۵) جمعیۃ العلماء کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے تحلیل کیا جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں انفرادی طور پر مسلمان کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست کریں گے مسلمانوں کی علاحدہ سیاسی شناخت نہیں ہوگی۔	مسلم جماعتوں کا وفاق ملک کی سیاست پر براہ راست اثر انداز ہوگا۔ البتہ کوئی ایسا سیاسی قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس سے علاحدگی پسندی کا الزام لگ سکے یا علاحدہ مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کا امکان پیدا ہو۔

۴۷ء اور ۶۴ء کی کانفرنسوں میں لب و لہجے کے فرق کے باوجود نظری اعتبار سے کسی واضح فرق کا سراغ نہیں ملتا۔ سید محمود نے یہ ہمت تو ضرور کی کہ کانگریس کے خول سے نکل کر انہوں نے دوسری ملی جماعتوں حتی کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل بیٹھنا قبول کر لیا اور اس طرح وہ یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ مسلمانوں کا وجود کانگریس سے الگ ہو کر دینی بنیادوں پر امت کی دوسری جماعتوں کے ساتھ ایک اہم رشتہ رکھتا ہے۔ گویا ملی

وفاداری سیاسی وفاداریوں پر سبقت لے جاسکتی ہے البتہ اب تک وہ جس متحدہ قومیت کے اسیر رہ چکے تھے اس سے یکسر تائب ہونا ان کے لئے ممکن نہ ہوا۔

پھر ذاتی طور پر وہ ایک بہت مضبوط شخصیت کے مالک نہ تھے جس کا اظہار آزمائش کے ایک لمحے میں وائسرائے سے ذاتی خط و کتابت کے درمیان ہوچکا تھا یہی وجہ ہے کہ جب سید محمود کی ملی سرگرمیوں، مشاورت کے انعقاد اور اس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی جیسی پارٹیوں کی شرکت پر ہندو دوستوں نے واویلا مچایا تو سید محمود نے اپنی ملی بیداری اور اسلامی شناخت پر اصرار کرنے کے بجائے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ وہ اس طرح فرقہ وارانہ مسلم جماعتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں (حوالے کے لئے دیکھئے۔ سید محمود کی مرار جی ڈیسائی سے مراسلت) رہا مروجہ مسلم سیاسی رویہ تو وہ اس عرصے میں کمزور ضرور ہوا جس کی باز گشت ۶۴ء کی کانفرنس میں سنائی دیتی ہے۔ البتہ بنیادی تصورات بڑی حد تک وہی رہے۔

۱۹۶۸ء میں عبد الجلیل فریدی کے راست سیاسی اقدام نے علاحدہ سیاست کی کامیابی کے امکانات تو ضرور روشن کر دیئے اور بہت سے مضطرب ذہنوں میں نئے سیاسی تجربے نے ہلچل مچادی لیکن عبد الجلیل فریدی کو کچھ تو زندگی نے اتنی مہلت نہ دی اور نہ ہی انہیں ایسے رفقائے کار میسر آئے جو اس مشن کو فکری بنیادوں پر منظم کرنے کا کام کرتے۔ مسلم مجلس کا تجربہ تاریک راتوں میں جگنو کی مانند ہے جس سے روشنی کا احساس تو یقینا ہوتا ہے لیکن یہ روشنی اتنی کافی نہیں کہ کسی واضح راستے کی نشاندہی کرسکے۔ حیرت ہے کہ فریدی کے حیرت انگیز تجربے نے ہمارے سیاسی مفکرین کو اس طرف متوجہ نہ کیا کہ وہ ملک میں نئے سیاسی میزانئے کی تشکیل کے لیے کوئی نئی حکمت عملی ترتیب دیتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو شاید یہ ہو کہ فریدی کے تجربے نے صرف امکانات کی ایک دنیا نہیں دکھائی تھی بلکہ سیاست کی بساط پر پائی جانے والی بڑی بڑی ناانصافیوں اور مسلم سیاست کی راہ میں امکانی خطرات کی نشاندہی بھی کردی تھی۔ آج بھی کسی نئی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کی راہ میں وہ رکاوٹیں جوں کی توں برقرار ہیں جن کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

۶۴ء کی لکھنؤ کانفرنس کو اس اعتبار سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اہمیت حاصل رہے گی کہ یہاں گو کہ نئے رویے کی بنیاد نہیں رکھی گئی لیکن سابقہ سیاسی رویے سے بیزاری اور نئے رویے کی ضرورت کا اظہار ضرور کیا گیا۔ آنے والے دنوں میں جب ملک کے سیاسی افق پر

سیکولرزم اور لبرل جمہوری اقدار کے غازے کی ضرورت باقی نہ رہی اور جب ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد کھلم کھلا مسز گاندھی نے فاتح ہندو دیوی کا روپ اختیار کرلیا تو مسلمانوں میں نئے سیاسی متبادل کی تلاش ہونے لگی۔ آگے چل کر بابری مسجد کے قبضے نے بی جے پی اور کانگریس کے درمیان ہندو کارڈ کی مسابقت مزید تیز کردی۔ گویا اب مسلمانوں کے لئے کانگریس سے دور کوئی سیاسی سہارا تلاش کرنا ناگزیر ہوگیا۔ اسی اثناء ملک کے افق پر علاقائی پارٹیاں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی سیاسی پارٹیاں متبادل کے طور پر مسلمانوں کے سامنے آئیں۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۶ء تک لوک سبھا کے انتخابات میں مسلمانوں کی سیاسی حکمت عملی بنیادی طور پر سید محمود کی سیاسی حکمت عملی کا تتمہ ہے۔ جس میں مسلم ووٹوں کے اجتماعی استعمال کا رجحان سامنے آتا ہے اور ہر چھوٹی بڑی سیاسی پارٹی سے اس ووٹ کے

مسلم مجلس کا تجربہ تاریک راتوں میں جگنو کی مانند ہے جس سے روشنی کا احساس تو یقینا ہوتا ہے لیکن یہ روشنی اتنی کافی نہیں کہ کسی واضح راستے کی نشاندہی کرسکے۔

مسلم اراکین پارلیامنٹ

(لوک سبھا)

سال	مسلم اراکین کی تعداد	% تناسب
1947 (جداگانہ طریقہ انتخاب رائج تھا)	31	13.10
1952	36	7.21
1957	24	4.47
1962	32	6.27
1967	29	5.68
1971	27	5.18
1977	32	6.03
1980	46	8.50
1984	41	7.60
1989	33	6.31
1991	28	5.03
1995	27	

عوض مراعات طلبی کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے لئے یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اپنے اس پچاس سالہ سفر میں ہندوستانی مسلمان کہاں سے کہاں پہنچے ہیں۔ کیا نئے ہندوستان میں ہم من حیث الامت کوئی واضح سیاسی راستہ بنانے میں کامیاب ہوسکے ہیں؟ اگر نہیں تو اس بات کا پتہ چلایا جائے کہ آخر اس راہ میں کیا کیا رکاوٹیں رہی ہیں، انہیں کس حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی اور اس عمل میں ہم کس حد تک کامیاب ہوسکے۔ ناکام تجربوں کے علاوہ کامیاب تجربے آخر ٹھٹھر کر کیوں رہ گئے۔ پھر ہم ان بنیادی سوالوں کے جواب فراہم کرنے کی کوشش بھی کریں جن سے کسی وجہ سے سیاسی قائدین کی پہلی نسل نے اپنا دامن بچایا تھا یعنی یہ کہ اس ملک میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہے؟ پھر ہم حقائق کی دنیا میں اس بات کے تعین کی بھی کوشش کریں گے کہ فی زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکنہ سیاسی متبادل کیا اور کیا ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم بعض بنیادی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ موجودہ سیاسی نظام میں کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا امکان اگر ہے تو کس حد تک۔

ہندوستانی پارلیامنٹ (لوک سبھا) کوئی پانچ سو چوالیس (۵۴۴) اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جس میں سے دو نشستوں پر صدر جمہوریہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اینگلو انڈین کمیونٹی کے دو افراد کو نامزد کرسکتا ہے اگر وہ الکشن کے ذریعہ پارلیامنٹ میں نہ آسکیں۔ اب ان ۵۴۲ نشستوں میں ۱۱۶ نشستیں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں۔ گویا کھلا مقابلہ صرف ۴۲۶ نشستوں پر ہے جن میں اگر مسلمان چاہیں تو اپنے نمائندے کھڑا کرسکتے ہیں۔ موجودہ سیاسی نظام کی ایک بڑی بے انصافی تو یہ ہے کہ طاقتور مسلم حلقہ ہائے انتخابات کو درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے اور دوسری طرف ان حلقوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ ان میں مسلم ووٹوں کی اہمیت تحلیل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ مشترکہ نظام انتخاب میں پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد ان کی اصل تعداد کے مقابلے میں ہمیشہ کم رہی ہے۔ البتہ ابتداء میں جب جداگانہ طریقہ انتخاب کو ختم نہیں کیا گیا تھا تو پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی تعداد 13 فیصد تھی جو بعد کے دنوں میں 8% سے زیادہ نہیں ہوسکی لیکن اس کے باوجود موجودہ سیاسی نقشے میں اب بھی کم از کم بیس ایسی پارلیمانی نشستیں موجود ہیں جہاں مسلمان اپنی بنیادوں پر الکشن جیت سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان مسلم پارلیمانی حلقوں کو آزاد کرالیا جائے جنہیں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لئے مختص کردیا گیا ہے تو موجودہ سیاسی نظام کی خامیوں کے

مسلم پارلیمانی حلقہ ہائے انتخاب

(جہاں مسلمان اب بھی صرف اپنی بنیادوں پر کامیاب ہوسکتے ہیں)

صوبے	حلقوں کے نام	مسلم آبادی کا تناسب
آسام	دھبری	43.40
	سلچر	39.10
آندھرا پردیش	حیدر آباد	38.00
بنگال	برہم پور	55.90
	جانگی پور	55.27
	مرشد آباد	55.19
	رائے گنج	39.04
	مالدہ	43.00
بہار	کشن گنج	37.00
	کٹیہار	39.10
یوپی	رام پور	45.00
	مرادآباد	42.00
	امروہہ	37.03
کشمیر	اننت ناگ	95.40
	بارہ مولہ	97.30
	سری نگر	90.60
کیرالا	پونانی	60.10
	مانجیری	60.90
	کالی کٹ	51.50
لکشدیپ		98.00

ابھر سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا اتنا واضح امکان موجود ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اب تک ان امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ گزشتہ پچاس سالہ مسلم سیاسی رویے کے احتساب کے لئے یہ سوال بنیادی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے ذہن سے امکانات کا یہ پہلو پوری طرح او جھل نہیں رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً مسلم سیاست کی نئی صف بندی پر گفتگو بھی ہوتی رہی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جنوب میں مسلم لیگ کے تجربے اور شمال میں مختصر عرصے کے لئے مسلم مجلس کے کامیاب تجربے سے اس نہج پر سوچنے کا سراغ ملتا ہے۔ پھر ایک مختصر لمحے کے لئے ہی سہی بنگال کی سطح تک مسلم لیگ کا تجربہ اسی نظریے کی غمازی کرتا ہے۔ البتہ ان محدود کامیاب تجربوں کے باوجود علاحدہ سیاسی صف بندی ایک طاقتور متبادل کی حیثیت سے اگر اب تک اپنی شناخت نہیں بنا سکی ہے تو اس کی بنیادی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ فکری اور نظری طور پر ملک کی مسلم سیاست آزاد کے لکھنؤ کنونشن سے اب تک خود کو پوری طرح آزاد نہیں کر پائی ہے۔ مسلم سیاست سے متعلق بعض بنیادی سوالات جس طرح لکھنؤ کنونشن میں حل طلب تھے اسی طرح آج بھی ان سوالوں پر ایک سنجیدہ بحث مطلوب ہے۔

سیاسی امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور نئی بااعتماد سیاسی صف بندی کے لئے لازم تھا کہ ہندوستان میں مسلم سیاست کے ہدف پر کھل کر گفتگو ہوتی اور یہ بات طے کرلی جاتی کہ مسلمانوں کی سیاست میں شرکت کا مقصد کیا ہے؟ وہ سیاست میں شرکت کے ذریعے کیا کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سیاست میں شرکت کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے کچھ تحفظات حاصل کرلئے جائیں اور غیر مسلم آقاؤں سے زندگی جینے کی کچھ زیادہ مراعات حاصل کرلی جائیں یا دونوں کے عوض ان سے اپنی جان و مال کے تحفظ کا سودا طے کرلیا

جائے تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ مقصد علاحدہ صف بندی کے مقابلے میں مختلف سیاسی پارٹیوں کی خوشنودی کے ذریعہ زیادہ آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پھر جو لوگ دوسروں سے اپنی زندگی کے طالب ہوں یا جو اپنی زندگی کے لئے ارباب حکومت کی نگاہ کرم کو لازم خیال کرتے ہوں انہیں یقینا علاحدہ سیاسی صف بندی ایک خطرناک سیاسی کھیل معلوم ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان امکانات کی موجودگی کے باوجود علاحدہ سیاسی صف بندی ایک طاقتور متبادل کی حیثیت سے مسلم سیاسی فکر میں اپنی جگہ بنانے میں اب تک ناکام رہی ہے۔

ایک دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ آزاد اور مدنی کی نسل کے بعد مسلم سیاست کو کوئی بالغ نظر شخصیت میسر نہ آسکی اور جو لوگ سیاسی میدان میں اپنی قسمت آزمائی کے لئے آئے ان کی حیثیت سیاسی طالع آزماؤں کی تھی۔ وہ کسی واضح سیاسی فکر کے ساتھ میدان میں نہیں آئے تھے۔ سابقہ سیاسی فکر سے بغاوت کے لئے ضروری تھا کہ فکری بنیادوں پر نیا سیاسی رویہ تشکیل دیا جاتا۔ ۶۴ء کی لکھنؤ کانفرنس نے جامد مسلم فکر میں ہلچل تو ضرور مچادی تھی لیکن بعد میں جن لوگوں نے سیاسی میدان کو اپنی سرگرمی کے لئے منتخب کیا ان کے پاس نہ تو کوئی سیاسی فلسفہ تھا اور نہ ہی وہ حوصلہ جو کسی نئے سیاسی فکر کی ترتیب کے لئے مطلوب ہوتا ہے۔ آزاد کے یہاں ذہن کے کسی گوشے میں تو یہ بات موجود تھی کہ وہ بنیادی طور پر مسلمان ہیں اور وہ اپنے اسلامی سرمائے کے کسی بھی حصے کو ضائع کرنا اپنا نقصان سمجھتے ہیں۔ بعد کی نسل اس بنیادی فکری چوکھٹے سے عاری تھی۔ اس کے پاس اگر کوئی مقصد تھا تو صرف یہ کہ سیاست کے میدان میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح وہ بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ بنیادی طور پر یہ اس کا شخصی Ambition تھا اگر چلتے چلاتے اس Process میں امت کا بھی کچھ بھلا ہو جائے تو اس پر اسے کچھ اعتراض نہ تھا کہ ان تمام حضرات کو اپنی سیاست بہرحال مسلم حوالے سے کرنی تھی۔ سیاست میں نظری رہنمائی اب ایک فضول چیز سمجھی جاتی تھی۔ علمائے کرام اور مشائخ، معتبر مصنفین اور شارحین اسلام، ان سبھوں نے سیاست سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ملی تحریکیں ہوں یا وقتاً فوقتاً برپا کی جانے والی تحفظ شریعت کی مہمیں، یہ سب کی سب سیاست سے اپنا دامن بچاتی تھیں۔ سکہ بند علماء کے یہاں بھی اسلام کی سربلندی کا قافلہ سیاست کی راہ داری سے ہو کر نہیں گزرتا تھا۔ اور جب سیاسی مسئلہ امت کے درمیان اتنا ناقابل اعتناء بن جائے تو عام مسلمانوں کو یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگتی کہ سیاست کی دنیا اہل تقوی کی دنیا سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہاں کسی قرآنی ہدایات کی ضرورت نہیں۔

آٹھویں دہائی میں جو لوگ مسلم سیاست کے حوالے سے میدان میں آئے ان کے یہاں سیکولرزم اور جمہوریت کے استحکام کا مسئلہ ایک جملہ معترضہ کے بجائے بنیادی فلسفے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اب اگر مسلمان سیاسی میدان میں متحرک تھے تو اس لئے نہیں کہ "اپنی خدمت سے

مسلم قوم کو نیک نامی بخشیں" یا یہ کہ "تاریخی اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں اس ملک کی خدمت ان پر کہیں زیادہ واجب تھی" بلکہ اب سارا زور اس بات پر تھا کہ ملک میں سیکولرزم کو فروغ ہو، جمہوریت جڑ پکڑے اور سیکولر آرڈر کو ہندو انتہا پسندوں سے جو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس کا سد

باب کیا جاسکے۔ ان بے چاروں کو سرے سے اس بات کا شعور نہ تھا کہ ان کا تعلق کس امت سے ہے اور یہ کہ سیکولرزم اور جمہوریت کی ترویج و اشاعت کے لئے انہیں اللہ اور اس کے رسول نے مامور نہیں کیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ سیکولرزم کے یہ مبلغ اپنے نئے نظریاتی چوکھٹے کی وجہ سے اب پہلی نسل کے مقابلے میں کہیں زیادہ بااعتماد یا باحوصلہ ہو گئے تھے یا پچھلی نسل کے Guilt Complex سے انہوں نے اپنا دامن چھڑا لیا تھا

اس لئے کہ ملک سے وفاداری اور اس کے جذبے جا اظہار کی رسم یہاں بھی ہنوز برقرار تھی۔ اگر کبھی کسی مرحلے میں ان حضرات سے کوئی ایسا قدم اٹھ گیا جس پر ان کی وطن پرستی پر سوالیہ نشان لگنے لگا یا ارباب اقتدار کی طرف سے لے دے ہونے لگی تو انہوں نے فوراً اپنا قبلہ تبدیل کر لیا۔ اور ایک غلطی کے لئے ہزاروں سجدہ سہو کئے جانے لگے۔

ایک ایسی فضا میں جب مسلم سیاست کے لئے کوئی اساس موجود نہ ہو اور کسی نئے، بڑے اور انقلابی قدم کے لئے کوئی جواز موجود نہ ہو کسی نئے سیاسی رویے کی تشکیل کا کام کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ ۷۰ء میں مسلم مجلس مشاورت کو اپنے عوامی منشور کو برتنے میں جتنی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس سے بھی کہیں زیادہ ناکامی اور مایوسی ۱۹۸۹ء کے مسلم سیاسی کنونشن کے منتظمین کے حصے میں آئی۔ ۷۰ء کے سیاسی تجربے نے ارباب مشاورت پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ مختلف سیاسی پارٹیوں میں پائے جانے والے "مسلم دوست" نمائندوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے باوجود عملی طور پر مشاورت کی جھولی میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔ کچھ تو ان میں نرے مفاد پرست ثابت ہوئے اور کچھ پارٹی ڈسپلن کے آگے مجبور تھے۔ ۱۹۸۹ء میں بھی اسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک منشور مطالبات ترتیب دیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی قائدین نے اپنی راہ بدل دی۔ حالانکہ بابری مسجد اور شاہ بانو کی ہنگامہ خیز تحریکوں نے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مسلم ووٹوں کے ارتکاز کا امکان پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اب بھی نظری طور پر چونکہ لوگوں کے ذہن صاف نہ تھے بلکہ سیاسی مسلمانوں کی ذہنی پراگندگی کا عالم یہ تھا کہ ان کی زبانیں اسلامی سیاسی فکر کی مخالفت میں بلاتکلف دلائل لاتی تھیں اور ان کی قابل ذکر اکثریت اس خیال کی حامل نہیں تھی کہ نئی مسلم سیاسی صف بندی کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی ہونا چاہئے۔ سیاست خواہ مسجد اور شریعت ہی کے حوالے سے کیوں نہ ہو لیکن یہ حضرات اس کے ذریعہ سیکولر آرڈر کا استحکام چاہتے تھے اور اگر معاملہ سیکولر آرڈر کے استحکام ہی کا ہو تو یہ کام ملک کی دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر بھی انجام دیا جاسکتا تھا۔ پھر کسی نئی مسلم سیاسی صف بندی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کسی واضح سیاسی فکر سے محروم اور سیاسی منزل کے

موجودہ سیاسی نقشے میں اب بھی کم از کم بیس ایسی پارلیمانی نشستیں موجود ہیں جہاں مسلمان اپنی بنیادوں پر الکشن جیت سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ان مسلم پارلیمانی حلقوں کو آزاد کرا لیا جائے جنھیں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لئے مختص کر دیا گیا ہے تو موجودہ سیاسی نظام کی خامیوں کے باوجود پارلیمنٹ میں وہ ایک طاقتور گروہ کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں۔

شعور سے خالی لوگوں کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک نئے سیاسی رویے کی بنیاد ڈالتے۔ نتیجتاً نئی مسلم سیاسی صف بندی کی شدید خواہش کے باوجود عملی طور پر یہ سوال التواء کا شکار رہا۔

گزشتہ پچاس برسوں کے فکری الجھاؤ اور سیاسی میدان کو دینی رہنمائی سے مکمل الگ کر دینے کے سبب اس ملک میں نیا سیاسی رویہ تشکیل دینے والوں کو کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سے بنیادی سوالات کا جواب فراہم کرنا پڑے گا۔ مسلم سیاسی صف بندی کے لئے اگر کوئی جواز فراہم ہو سکتا ہے تو اسی صورت میں جب مسلمان نظری طور پر اس بات کو تسلیم کر لیں کہ ان کا بنیادی فریضہ اس ملک کو ایک سیاسی سمت عطا کرنا ہے۔ اگر موجودہ سیاسی روش کو ہی اعتبار بخشنا ہو یا محض اپنے لئے تحفظات کا دائرہ وسیع کرنا مقصود ہے تو اس کے لئے اتنے انقلابی اور جراتمندانہ قدم کی ضرورت نہیں ہوگی البتہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے سیاسی کارواں کی رہنمائی ان کی مذہبی ذمہ داری ہے اور خیر امت کی حیثیت سے اس کرہ ارض پر وہ قائدانہ منصب کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں تو یقیناً ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر انہیں اس سمت میں قدم اٹھانا چاہئے اور موجودہ سیاسی امکانات کو اس مقصد کے لئے بھرپور استعمال کرنے کا جتن کرنا چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مسلمان اس سمت میں کوئی قدم بڑھائیں انہیں ان بنیادی سوالات کے جواب فراہم کرنا ہو گا جو ۴۷ء سے اب تک حل طلب ہیں اور جن کا غیر واضح، اجمالی اور مبہم جواب فراہم کر کے سیاسی قائدین کی پہلی نسل نے کچھ اس طرح الجھا دیا ہے کہ اب اس کے واضح جواب فراہم کرنا ایک مجددانہ نظر چاہتا ہے۔ کیا مسلمان اپنی علیحدہ سیاسی صف بندی اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس ملک کی دوسری قوموں کے مقابلے میں کوئی بہتر سیاسی فلسفہ موجود ہے؟ کیا اس ملک میں مسلمانوں کا سیاسی ایجنڈا دوسری قوموں سے مختلف ہے؟ کیا متحدہ قومیت کا تصور اور مشترکہ ایجنڈے کا تصور اب اپنی قدر و قیمت کھو چکا ہے؟ کیا مسلمانوں کا ملی مفاد ایک خالص نیشنلسٹ ملکی مفاد سے کسی قدر مختلف ہے؟ کیا ہندوستانی مسلمان سرحدوں سے باہر بھی ایک بین الاقوامی امت کی حیثیت سے عالمی سیاسی افق پر اپنا کوئی رول دیکھتے ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوشگوار ہندوستان کی مسلم تعبیر کیا دوسری غیر مسلم تعبیروں سے مختلف ہے؟ ان سوالات کا واضح جواب فراہم کئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی قافلے کے لئے کوئی راستہ بنانا ممکن نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان سوالات کا واضح جواب اس وقت تک فراہم نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستانی مسلمانوں کا غبار آلود فکری مطلع صاف نہیں ہوتا۔ آیئے یہ دیکھیں کہ اپنے آپ کو دین کا سچا پیرو کہلانے والی امت بعض بنیادی فکری سوالوں پر گومگو کا شکار کیوں ہے، اس کے اندر فکری کج روی کہاں کہاں پیدا ہو گئی ہے اور نظری اعتبار سے غیر اسلامی، اجنبی، درآمد شدہ فکر نے بعض مسلمات پر کس طرح اپنا سایہ اتنا گہرا کر دیا ہے کہ اصل حقیقت نظر آنا مشکل ہو رہی ہے۔ کسی پیش قدمی سے پہلے لازم ہو گا کہ پچاس سالہ فکر کا جائزہ لیا جائے اور ان فکری التباسات سے پردہ اٹھایا جائے جو اس دوران مختلف خوش کن اصطلاحات کے سہارے ہمارے یہاں در آئے ہیں۔

اس خصوصی اشاعت
میں تاخیر کی وجہ سے
ستمبر کا شمارہ
شائع نہیں ہوگا
اکتوبر کا شمارہ
ان شاء اللہ حسب معمول
شائع ہوگا
یقین جانیں

ہندوستانی مسلمانوں کا نظریاتی انحراف

اسلام سے سیکولر ڈیموکریسی تک پچاس سالہ سفر کی ایک کربناک داستان

تقسیم ہند کے بعد بھارتی ہند میں کوئی چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ ان چار کروڑ نفوس کی قیادت کے لئے اس ملک میں نامور علماء کرام، سیاسی شخصیات اور روحانی قیادت موجود تھی۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کے اہم دینی ادارے اور معروف علمی درسگاہیں بھی اسی ہندوستان میں موجود تھیں۔ دینی جماعتوں، انجمنوں اور مشائخ کے حلقے بھی منقسم طور پر ہی سہی ان کا بھی ٹوٹا بکھرا دارہ یہاں موجود تھا۔ لیکن ان تمام روحانی و علمی شخصیات کی موجودگی کے باوجود ہندوستان کی مسلم قیادت اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے سے قاصر رہی کہ بھارتی ہند میں مسلمانوں کا مقام کیا ہوگا۔ اور یہ کہ آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمان اپنے لئے کیا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تب سے اب تک کوئی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اس سوال کا کوئی واضح جواب فراہم کیا جانا باقی ہے۔ دیکھا جائے تو فطری اعتبار سے ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں نے جس نامعلوم منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا تھا آج بھی وہ اسی نامعلوم منزل کی طرف گامزن ہیں۔ مذہبی قائدین ہوں یا دینی جماعتیں، روحانی شخصیات ہوں یا خالص سیاسی مسلمان ان میں سے کسی کا ذہن کا بھی شاید ہی اس مسئلے پر صاف ہے کہ وہ بالآخر اس امت کے کارواں کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ انکی چلت پھرت اور دوڑ دھوپ آخر اس امت کو کس مقام پر فائز کرنے کے لئے جاری ہے۔ اور جب مسافر کو منزل کا پتہ معلوم نہ ہو اور اپنے سفر کی اہمیت کا قطعی شعور نہ ہو تو اس کے قدموں کا مختلف متضاد راہوں میں اٹھ جانا غیر متوقع نہیں۔

تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں کی روحانی قیادت بڑی حد تک دارالعلوم دیوبند اور جمیعۃ العلماء سے وابستہ علماء پر مشتمل تھی اور ابوالکلام آزاد بڑی حد تک سیاسی قیادت کا اعلامیہ سمجھے جاتے تھے۔ علمائے دیوبند ہوں یا ابوالکلام آزاد ان حضرات سے امت کو بجا طور پر اس بات کی توقع تھی کہ وہ اپنے دینی علوم کی بنیاد پر امت کے لئے جو راستہ بھی منتخب کریں گے وہ کتاب وسنت سے الگ کوئی راستہ نہ ہوگا۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب اور افسوسناک حقیقت ہے کہ بھارتی ہند میں اسلامیان ہند کے کارواں کا رخ متعین کرنے میں ان حضرات کے ذہنوں پر کتاب وسنت کے بجائے گاندھی جی کے خیالات کا زیادہ غلبہ رہا۔ ان بزرگوں کی تحریریں اور تقریریں پڑھ جائیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات دو وابستگیوں کے درمیان کوئی راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو کتاب و سنت کے واضح ارشادات کا بوجھ ہے اور دوسری طرف متحدہ قومیت کے نظریے سے نبھانے کی کوشش۔ فکری طور پر تو یہ حضرات رسول اکرم کی قیادت کے قائل ہیں البتہ عملی طور پر گاندھی جی کی روحانیت کے آگے ان کے سر جھک گئے ہیں۔ ان دو وابستگیوں سے نبھانے کی کوشش میں، شرعی اصطلاحات اور قیل و قال سے فکری پراگندگی کی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی کے سامنے جب یہ سوال رکھا گیا کہ کیا آزاد ہندوستان میں جہاں مسلمان اور غیر مسلموں کے تعاون سے ایک نظام حیات تشکیل دیا جائے گا اسے اسلام کا مطلوبہ نظام کہا جاسکے گا یا
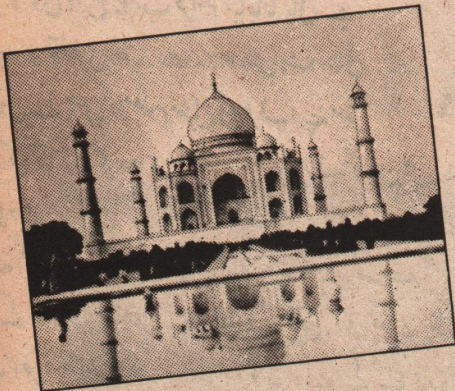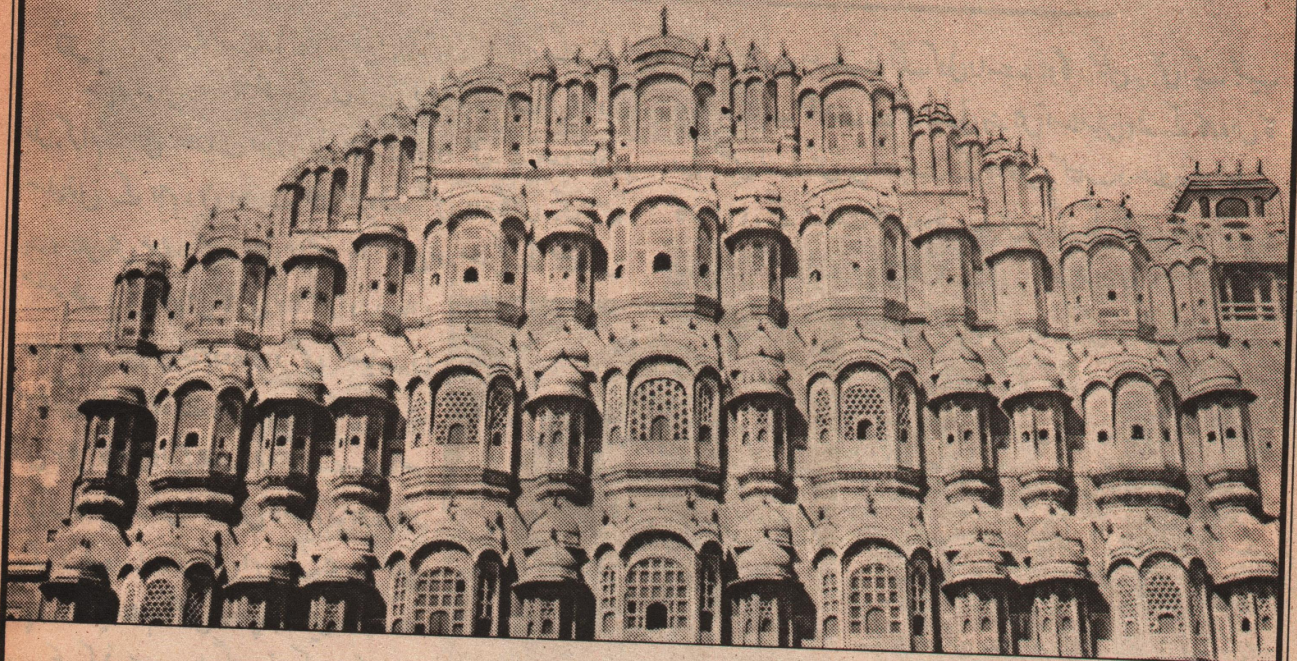
یہ بھی ایک عجیب اور افسوسناک حقیقت ہے کہ بھارتی ہند میں اسلامیان ہند کے کارواں کا رخ متعین کرنے میں ان حضرات کے ذہنوں پر کتاب و سنت کے بجائے گاندھی جی کے خیالات کا زیادہ غلبہ رہا۔

نہیں اور یہ کہ اگر آزادی کے بعد قائم ہونے والا سیاسی نظام اسلامی نظام نہیں ہوتا تو آخر کسی ایسے نظام کے قیام کی کوشش کا جواز کیا ہے۔ تو آپ نے اس سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے فرمایا:

इंडियन एयरलाइन्स
Indian Airlines
India's Airline

"مختلف قوموں کے اس اشتراک کی وجہ سے آزادی کے بعد ملک میں جو نیا نظام قائم ہوگا اس کی تعمیر میں مسلم وغیر مسلم دونوں شریک ہوں گے یہ مشترکہ نظام اگرچہ مکمل طور پر اسلامی معیار کے مطابق نہ ہوگا تاہم اس میں مسلمانوں کا ایک اہم اور مؤثر عنصر ہوگا اب یہ خود مسلمانوں کی حکمت تبلیغ پر منحصر ہے کہ وہ آنے والے نظام کو کس حد تک اسلامی معیار پر اتار سکتے ہیں انہی وجوہ سے آزادی کے بعد قائم ہونے والے مشترکہ نظام کو موجودہ نظام کے مقابلہ میں "اھون البلیتین" قرار دیا جاتا ہے" (مکتوب شیخ الاسلام منقول اخبار نئی دنیا شیخ الاسلام نمبر مورخہ ۹ جنوری ۱۹۵۸ء)

مسلمانوں کی اور ہندوؤں کی مشترکہ جد جہد کے نتیجے میں مستقبل کا جو نقشہ ترتیب پائے گا اس کا صحیح ادراک کرنے کے بجائے ساری ذمہ داری مسلمانوں کی آئندہ حکمت تبلیغ پر ڈال دی گئی اور یہ بات فرض کر لی گئی کہ آنے والے دنوں میں اچانک یہ امت جس کا شیرازہ منتشر ہے، اخلاقی حالات تباہ ہیں، کسی مشترکہ و متحدہ قیادت سے دور ہے اور فریضہ دعوت حق کے شعور سے پوری طرح خالی ہے وہ اچانک مبلغین کی فوج میں تبدیل ہو جائے گی، اگر یہ کام اتنا ہی آسان تھا اور سارا معاملہ حکمت تبلیغ کا تھا تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امت کی شیرازہ بندی کے بعد اسی حکمت تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو مؤثر عنصر کے مقام سے آگے بڑھا کر قیادت کے منصب پر فائز کر دیا جاتا اور اگر مسلمانوں کو انگریزی نظام کے اندر ایک مؤثر عنصر کی حیثیت سے سامنے لانا اور فیصلہ کن قوت عطا کرنا ممکن نہ تھا تو بعد کے دور میں اچانک انگریزوں کے چلے جانے سے یہ کام کیسے انجام پا سکتا تھا؟ اس

پھر آخر یہ حضرات چاہتے کیا تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے اگر کسی دارالاسلام کے قیام کا خواب نہیں دیکھتے تھے، اگر ان کی جدوجہد کا مقصد اللہ کی شریعت کی سربلندی نہیں تھا تو خود ان ساری دوڑ دھوپ اور جدجہد کی شرعی طور پر کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

سوال کا کوئی سیدھا جواب دینے کے بجائے مولانا مدنی نے "اھون البلیتین" کے فلسفے کا سہارا لیا اور اس فیصلے کی خود کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مستقبل کے مبلغین اور ان کی حکمت تبلیغ کے سر ڈال دیا۔

تو کیا مولانا حسین احمد مدنی کو اس بات کی کوئی امید تھی کہ مستقبل کے ہندوستان میں رفتہ رفتہ مسلمان دوبارہ ایک فیصلہ کن قوت حاصل کر لیں گے اور آنے والے دنوں میں ان کوششوں سے ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنایا جا سکے گا؟ مولانا مدنی کی تحریروں اور ان کی تقاریر سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ پھر آخر یہ حضرات چاہتے کیا تھے؟ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد سے اگر کسی دارالاسلام کے قیام کا خواب نہیں دیکھتے تھے، اگر ان کی جدوجہد کا مقصد اللہ کی شریعت کی سربلندی نہیں تھا تو خود ان ساری دوڑ دھوپ اور جدجہد کی شرعی طور پر کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس سوال سے ہم آگے بحث کریں گے۔

سید محمود

نئے ہندوستان میں اس بات کی باشعوری کوشش کی جاتی رہی ہے کہ مسلمانوں کی ملی زندگی کی شیرازہ بندی کی جائے اور ان کو شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں۔ تقسیم ہند سے قبل ہی مسلم قیادت کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ آنے والے دنوں میں دلی کی سرزمین پر مسلمانوں کی فیصلہ کن حیثیت باقی نہیں رہ پائے گی تب مضطرب مسلم ذہنوں میں یہ سوال اٹھنے لگا تھا کہ اگر نیا نظام ایک اسلامی زندگی جینے کے مواقع فراہم نہیں کرتا تو اسے شرعی بنیادوں پر کس طرح قبول کیا جائے گا۔ تب بھی ان سوالوں کا کوئی واضح جواب فراہم کرنے کے بجائے مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ ان کا کام صرف علماء کی پیروی کرنا ہے اور علماء میں بھی وہ لوگ جو وارثان نبی ہوں۔ جنہیں علم لدنی اور علم معرفت دونوں حاصل ہو اور محض وحی پر بھروسہ کرنے کے بجائے القاء ربانی اور الہام باطنی سے کام لیتے ہوں۔ علمائے اہل دیوبند کی نظر میں خود ان کے اندر یہ شان بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لئے عام مسلمانوں سے یہ توقع کی گئی کہ وہ آنکھ بند کر کے ان علماء کی پیروی کریں۔ وہ جدھر لے جانا چاہتے ہوں ادھر چلیں کہ ان کے پاس صرف کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ وحی کے علاوہ موجودہ زمانے کی وحی یعنی القائے ربانی اور الہام باطنی بھی موجود ہے۔ مولانا قاری محمد طیب نے جمعیۃ العلماء کے ایک جلسے میں اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ بحران کی اس فضا میں امت کی کشتی کو صرف اور صرف جمعیۃ العلماء کے علماء ہی پار لگا

کیا شرعی اعتبار سے کسی امیر شریعت یا امیر الہند کے لئے جائز ہے کہ وہ مسلمانوں کو نظام کفر کی معصیت میں رکھ کر شرعی زندگی جینے کا فن سکھائے۔ یا وہ نظام کفر سے کوئی اعراض نہ برتے اور پھر بھی یہ دعوی کرے کہ اس کی جدوجہد اسے شرعی زندگی جینے اور جلانے کے لئے ہو رہی ہے۔

سکتے ہیں انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کے لئے یہ شرط عائد کردی کہ محض اس کا:

"عالم ہونا یا کتابوں کے درس و تدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بایں معنی ان میں وارثت نبوت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور ترددات سے بالاتر ہو۔ ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو تقوی وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ہو۔ وہ ضلوا و اضلوا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں پھر جب کہ ان دونوں اوصاف انکشاف باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کرلیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے" (اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام۔ خطبہ صدارت بمبئی، ۱۹۴۶ء، قاری محمد طیب)

اور چونکہ علماء کا یہ گروہ اپنے اتحاد کی وجہ سے عصمت کی شان بھی پیدا کرچکا تھا اس لئے اس سے کسی غلط فیصلے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا۔ پھر اس نئی تشریح کے مطابق محض کتاب وسنت کے حوالے سے کسی فیصلے کو صحیح یا غلط قرار دینا ممکن نہ تھا کہ اب پرانی وحی کے مقابلے میں نئی وحی کے حاملین معصوم علمائے کرام کی فوج ظفر موج امت کو موجودہ بحران سے نکالنے کے لئے میدان میں آچکی تھی۔ کتاب وسنت کے مقابلے میں علمائے کرام کے قول کو ترجیح دینے کا یہی وہ رجحان تھا جس نے آنے والے دنوں میں اہم مسائل پر غور وفکر کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کا دروازہ بند کردیا۔ اس رویے نے نہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں کے دل ودماغ پر پہرے بٹھائے، اہم سیاسی رہنما مسائل پر رہنمائی کے لئے جب کبھی بھی ضرورت پڑی امت نے علماء کی طرف دیکھنے کو کافی سمجھا اور چونکہ ان معصوم علماء کے فیصلے آپس میں مختلف اور متضاد تھے اس لئے بددل ہو کر عام مسلمانوں نے ان کی رہنمائی سے یکسر آنکھیں بند کرلیں۔

ہمارے لئے مسئلے کا جو پہلو فی الوقت غور طلب ہے وہ یہ کہ کیا بزرگوں کی یہ نسل علمائے کرام کی انجمن بنا کر واقعی یہ سمجھتی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے کوئی شرعی زندگی جینے کا انتظام کرلے گی۔ علماء کی انجمن اور اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان کسی خاص عالم کو خواہ کتنا ہی اعتبار کیوں نہ حاصل ہو جائے اور وہ اپنے مریدوں کے حلقے میں خواہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو نئے نظام کے اندر مسلمانوں کے اس امیر کی حیثیت ایک معمولی اہلکار سے زیادہ نہ تھی۔ لہذا جمعیتہ کے بڑے بڑے باکمال علماء خواہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اقتدار کل کے مالک ہی کیوں نہ ہوں نئے نظام میں ان کی حیثیت کسی حاشیہ نشیں سے زیادہ نہ تھی۔ خود مسلمانوں کی سب سے بڑی شخصیت ابوالکلام آزاد گاندھی کے ارادتمندوں میں سے تھے جن کی ساری روحانی عظمت اور ورثۃ الانبیاء کی حیثیت گاندھی کی مہاتمائی روحانی شخصیت کے آگے پھیکی پڑ گئی تھی۔ بعد کے دنوں میں بھی مختلف سطحوں پر ملک کے اندر جو شرعی نظام قائم کیا گیا یا جو لوگ امیر الہند کی حیثیت سے سامنے آئے وہ اس سیاسی نظام کے اندر امت کے لئے تو کجا اپنے لئے بھی کوئی باوقار رول دریافت نہ کرسکے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وراثت کا دعوی کرنے والی امت یا اس امت کے چیدہ افراد نظام کفر کے حاشیہ بردار کی حیثیت قبول کرلیں۔ کیا شرعی اعتبار سے کسی امیر شریعت یا امیر الہند کے لئے جائز ہے کہ وہ مسلمانوں کو نظام کفر کی معصیت میں رکھ کر شرعی زندگی جینے کا فن سکھائے۔ یا وہ نظام کفر سے کوئی اعراض نہ برتے اور پھر بھی یہ دعوی کرے کہ اس کی جدوجہد اسے شرعی زندگی جینے اور جلانے کے لئے ہو رہی ہے۔

امت کی شیرازہ بندی کا مقصد اگر اس ملک میں شریعت کی بالادستی قائم کرنا نہیں تھا، اگر امت کو کسی دینی قیادت پر یکجا کرنے کے پیچھے ایک اسلامی نظام حیات کی تشکیل نہیں تھی تو آخر کون سا نظام تھا جو قائدین کی پہلی نسل مسلمانوں کے اتحاد سے لینا چاہتی تھی۔ اگر موجودہ نظام کو الٹ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام حق قائم کرنا ان بزرگوں کے پیش نظر نہیں تھا تو آخر یہ ساری

چلت پھرت وعظ اور تقاریر، کانفرنسوں اور جلوسوں سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اپنی موت سے چند روز پیشتر مولانا حسین احمد مدنی نے نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جو راہ عمل تجویز کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔

"ان ملکوں میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے اور مسلمان اپنی اقلیت کی وجہ سے وہاں پر نہایت کمزور اور ان کی آواز نہایت گری ہوئی ہے اشد ضرورت ہے کہ ان میں اجتماعی قوت اور نظام مکمل ہو۔ بالخصوص انڈین یونین (بھارت) میں تقسیم ہند کے بعد یہ ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اس لئے تمام مسلمانوں کا عموماً اور علمائے اسلام کا خصوصاً اہم فریضہ ہے کہ وہ جاگیں اور تحفظ بقا کی صورتیں عمل میں لائیں، اختلافات کو مٹائیں اور اجتماعی قوتوں کو بڑھا کر صحیح نظام پر گامزن رہیں۔"

(موت سے چند روز پیشتر مکتوب بنام غلام محمد مصطفی روزنامہ الجمعیۃ دہلی ص ۹، ۱۰ شیخ الاسلام نمبر ۱۰ فروری ۱۹۵۸ء)

کل تک جن لوگوں نے امت کو اپنی رہنمائی کی صحت کا پورا پورا یقین دلایا تھا، کل تک جو لوگ حسن تبلیغ کے ذریعہ نئے نظام کو اپنی آرزوؤں کی راہ پر ڈالنے کا ولولہ رکھتے تھے آج وہی لوگ اب اس امت کو تحفظ اور بقا کی صورتیں عمل میں لانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اب اقدامی عمل سے کنارہ کش ہو کر دفاعی حیثیت میں سارا کام کرنے پر زور تھا۔ گویا روز اول سے قائدین کی پہلی نسل نے امت کو جو درس دیا وہ یہ تھا کہ وہ اس ملک میں اپنی بقا اور تحفظ کی فکر کریں "اختلافات کو مٹائیں" "اور اجتماعی قوتوں کو بڑھا کر صحیح نظام پر گامزن رہیں" لیکن یہ صحیح نظام کیا تھا اور اس پر کیسے گامزن ہوا جا سکتا تھا اس بارے میں ان کے پاس نہ تو کوئی پروگرام تھا اور نہ منصوبہ، اصل زور تو تحفظ پر تھا۔ صحیح نظام کا تذکرہ تو ایک ناآسودہ آرزو کی حیثیت سے گاہے بہ گاہے زبان پر آجاتا تھا ورنہ اگر اس نظام کی طرف لے چلنے کا کوئی واقعی پروگرام ہوتا تو اس کا تذکرہ محض روا روی میں چلتے چلاتے نہ ہوتا اور اس کے لئے کوئی واقعی Blue Print بھی پیش کیا جاتا۔ کچھ یہی حال آزاد کے یہاں بھی تھا جو اب تک اسلاف کی عظمت اور اسلامی ہند کی تاریخ سے اپنا پیچھا نہ چھڑا پائے تھے اور جو ان کے ہاں گاہے بہ گاہے مایوس خطابت کی شکل میں ڈھلتی رہتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے تو یہ بات سچ تھی کہ جمنا کے کنارے ہمارے بزرگوں نے وضو کیا تھا، اس خطابت سے یقیناً حوصلے کو جلا ملتی تھی لیکن حقیقت کی دنیا میں نیا نظام بزرگوں کے تمام آثار مٹانے کے درپے تھا۔ لہٰذا اب جس بات پر سب سے زیادہ زور تھا وہ یہ کہ مسلمان اپنے تحفظ کی فکر کریں۔

آنے والے دنوں میں عام ملی رویہ اسی احساس عدم تحفظ اور محرومی کے زیر اثر تشکیل پایا لہٰذا معاملہ زبان کا ہو یا شریعت کا مسلم اداروں کا ہو یا اوقاف اور عبادت گاہوں کا مسلمان اقدامی ایجنڈے سے یکسر کنارہ کش ہو کر تحفظ کی سیاست کے شکار ہو گئے۔ دینی اور روحانی قیادت ہو یا سیاسی اور سیکولر لیڈرشپ، ہر کسی نے تحفظ کی ایسی پر زور مہمیں چلائیں کہ عام ذہنوں سے یہ تصور بھی محو ہوتا گیا کہ آخری رسولؐ کی امت پر محض اپنے تحفظ کا نہیں بلکہ دنیا کی رہنمائی کا فریضہ بھی عائد کیا گیا ہے۔ پھر قائدین کی پہلی نسل پر تقدس اور روحانیت کا ایسا دبدبہ تھا کہ مضطرب مسلمانوں کو یہ پوچھنے کی جرات بھی نہ ہوئی کہ اگر جان ومال، دین اور دینی مظاہر کے تحفظ کے لئے اتنا ہی کچھ جتن کرنا تھا تو یہ سب کچھ تو پرانے نظام میں بھی انجام دیا جا سکتا تھا، اس کے لئے ہندوستان کو آزاد کرانے اور آزادی کی طویل جنگ میں امت کو جانی اور مالی قربانیوں سے گذارنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا انگریزوں سے تحفظ شریعت کی جنگ لڑنے کے مقابلے میں اپنے ہم وطنوں سے یہ لڑائی زیادہ ثواب کا باعث تھی پھر اگر اس پوری طویل جدوجہد میں امت اپنے پیغمبرانہ منشور کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کر سکی تو اس لایعنی جدوجہد کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ آخر آپ نے کون سی پسندیدہ دنیا بنائی تھی جس میں مسلمانوں کا دین، ان کی ثقافت اور ان کی عبادت گاہیں سخت خطرے سے دوچار تھے۔ شرعی اعتبار سے کیا کسی ایسی صورت حال کو مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے یا اسے آزادی کا ہم معنی گردانا جا سکتا ہے؟ عام مضطرب مسلمان کے ذہن
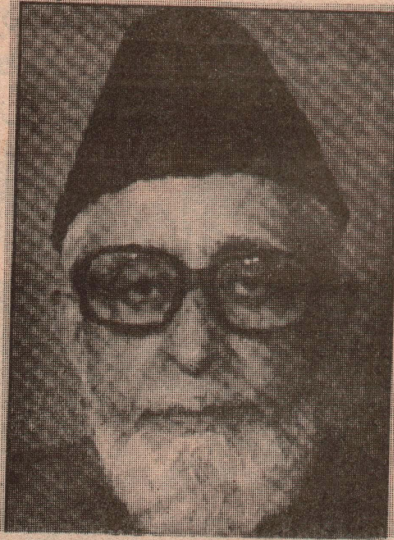
اگر جان ومال، دین اور دینی مظاہر کے تحفظ کے لئے اتنا ہی کچھ جتن کرنا تھا تو یہ سب کچھ تو پرانے نظام میں بھی انجام دیا جا سکتا تھا اس کے لئے ہندوستان کو آزاد کرانے اور آزادی کی طویل جنگ میں امت کو جانی اور مالی قربانیوں سے گذارنے کی ضرورت کیا تھی؟

میں یہ سوال کہیں نہ کہیں موجود ضرور تھا البتہ حالات کی سختی کسی نئی فقہی موشگافی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس لئے عملاً ان بنیادی سوالات پر غور کرنے کے بجائے جمہور امت حفاظت کے کام میں زور و شور سے لگ گئی۔

حفاظت چونکہ اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک مدافعانہ رویہ ہے۔ جو لوگ چہار طرف سے ہونے والے پے در پے حملوں سے پریشان ہوں، جن کی سرگرمیوں کا واحد مرکز و محور اپنی جان و مال بچالے جانا اور اذیت ناک زندگی کے لئے کچھ اور مہلت حاصل کر لینا ہو کسی ایسے انسانی گروہ سے قیادت یا رہنمائی کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ پھر کسی مدافعانہ طرز عمل میں یہ قوت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کا کلی طور پر تحفظ ہی کر سکے۔ انسانی دنیا میں نظریات ہوں یا اشیاء، خیال ہو یا مادہ اپنی اصل حالت میں زیادہ دنوں تک جوں کا توں برقرار نہیں رہ سکتے۔ یہی حال کسی انسانی گروہ یا امت کا ہے یا تو وہ آگے بڑھے گا یا رفتہ رفتہ زوال کا گھن اسے چاٹ جائے گا۔ عملی دنیا میں تحفظ قابل عمل فلسفہ نہیں ہوسکتا۔ لہذا کوئی امت اگر ارتقاء کی طرف گامزن نہیں ہو اس کے یہاں خیالات کے تخلیقی دھارے خشک ہونے لگے ہوں یا وہ نئی بلندیوں تک سفر کے ارادے کو ترک کر کے موجودہ پوزیشن پر برقرار رہنا چاہتی ہو تو عملاً ہوتا یہ ہے کہ آنے والا ہر دن اس کے تخلیقی سرچشمے کو خشک کرتا چلا جاتا ہے۔ فرد ہو یا گروہ اگر وہ آگے بڑھنے سے منہ موڑ لے تو اسے کوئی قوت پیچھے ہٹنے سے نہیں روک سکتی۔ کسی مخصوص مقام پر جوں کا توں اپنے آپ کو برقرار رکھنا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحفظ کی سرتوڑ جدوجہد کے باوجود اس امت نے رفتہ رفتہ اپنا بہت کچھ قیمتی سرمایہ کھو دیا ہے ہندی مسلمانوں کی مخصوص ثقافت ہو یا شمالی ہند کے مسلمانوں کا لسانی طریقہ اظہار، ملی زندگی کی جلوہ سازیاں ہوں یا ایک عظیم امت ہونے کا احساس یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ طرفہ تو یہ ہے کہ اب ہماری قابل ذکر اکثریت اس شعور سے بھی خالی ہو چکی ہے کہ آخری رسول کی امت کی حیثیت سے سیادت اور رہنمائی کا فریضہ مسلمانوں کو انجام دینا ہے۔ ہم بدقسمتی سے اس خواب سے بھی دست کش ہو چکے ہیں کہ روایتی طور پر ایک سابق دارالاسلام کے شہری کی حیثیت سے اس ملک کو دوبارہ کہیں

بہتر انداز سے دارالاسلام بنانے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ پچھلے پچاس سالہ سفر میں ہم سے جو سب سے اہم سرمایہ کھویا گیا ہے وہ یہ کہ

اب ہماری محترم شخصیات اور روحانی قیادت بھی اس ملک میں کسی الٰہی نظام کے قیام کے بجائے نظام کفر کے استحکام کے لئے علی الاعلان اپنی قوتیں صرف کر رہی ہے وہ لوگ جن سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ اس نازک صورت حال میں امت کی صحیح قیادت فرمائیں گے۔ افسوس کہ وہی صلحائے امت اب اعلائے کلمۃ اللہ کے بجائے نظام کفر کے استحکام کی کھلی دعوت دے رہے ہیں۔

مودودی

ہمارے اندر اپنی موجودہ زبوں حالی اور اس خطے میں اپنی شاندار تاریخ کا احساس جاتا رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عملاً ہوا یہ ہے کہ ہم اپنے انبیائی خواب سے دست کش ہو کر غیر اسلامی خوابوں کے اسیر ہو گئے ہیں۔ اب ہماری محترم شخصیات اور روحانی قیادت بھی اس ملک میں کسی الٰہی نظام کے قیام کے بجائے نظام کفر کے استحکام کے لئے علی الاعلان اپنی قوتیں صرف کر رہی ہے۔ وہ لوگ جن سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ اس نازک صورت حال میں امت کی صحیح قیادت فرمائیں گے افسوس کہ وہی صلحائے امت اب اعلائے کلمۃ اللہ کے بجائے نظام کفر کے استحکام کی کھلی دعوت دے رہے ہیں۔

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران ہماری مذہبی قیادت نے اس بات کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے کہ موجودہ نظام کی شرعی حیثیت متعین کی جائے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں موجودہ ہندوستانی نظام کس حد تک ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے اور کس حد تک اس نظام میں ہمارے قرآنی خواب کی تعبیر کا امکان پایا جاتا ہے اس بارے میں ہمارے علمائے کرام نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور عملاً چونکہ علمائے کرام کی چلت پھرت نے موجودہ نظام کو ہی اعتبار بخشا ہوا ہے اس لئے مسلمانوں کے اندر یہ احساس عام ہے کہ موجودہ نظام اگر اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ حرکت میں آجائے تو مسلمانوں کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملی جلسوں اور ان کی قرارداد میں شدت سے اس آرزو کا اظہار ہوتا رہا ہے کہ

اس ملک میں سیکولر جمہوری نظام کو پوری طرح فعال بنایا جائے تاکہ مسلمان اس نظام کی برکتوں سے فیضیاب ہوں۔ سیکولرزم اور جمہوریت کے استحکام کا غلغلہ کچھ اتنی شدت کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی عقیدے کا جز ہو اور یہ کہ موجودہ ہندوستان میں ایک سیکولر آرڈر کا قیام گویا مسلمانوں کی مذہبی اور ملی ذمہ داری ہے۔ نوبت بایں جارسید کہ مساجد کے جن منبروں اور مدارس کی جن چہار دیواریوں سے نظام خلافت کے قیام کی صدا بلند ہونی چاہیے تھی وہاں سے ان کافرانہ عقائد کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں بعض اجنبی خیالات اور تصورات نے ہمارے فکری سانچے میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنالی ہے کہ اب یہ سب کچھ اسلامی عقیدے کا حصہ معلوم ہوتا ہے ان تصورات کے اسیر صرف سیکولر مسلم دانشور یا سیاسی قسم کے مسلمان نہیں بلکہ رتبہ والے علماء کرام اور حاملین دین اور شرع متین بھی ہیں۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ہم صرف چند مروجہ تصورات کا ذکر کریں گے جس نے ہماری سیاسی فکر میں اہم ستون کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔

اسلام اور موجودہ سیکولر ڈیموکریسی

کیا سیکولرزم سیاسی فلسفے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے؟ ہندوستانی سیکولرزم جو دراصل اس بات سے عبارت ہے کہ ریاست امور زندگی چلانے میں کسی بھی مذہبی رہنمائی سے آزاد ہوگی۔ فرد کی ذاتی زندگی تک ہر شخص کو اس بات کی آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنی پسند کا مذہب اختیار کر سکے۔ البتہ کاروبار حکومت کو چلانے یا زندگی کے اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں کسی مذہبی احکام کی پاسداری نہیں کی جائے گی۔ یہ ہے ہندوستانی سیکولرزم کا سیدھا سا مفہوم۔ ایک بین المذاہبی ملک میں یہ تاویل خواہ کتنی ہی خوش کن کیوں نہ معلوم ہوتی ہو شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ دین کو فرد کی زندگی کا ایک پرائیوٹ معاملہ قرار دے لیں۔ شریعت کی نظر میں زندگی کے کسی بھی گوشے میں اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے عمداً پہلوتہی یا اسے لپیٹ کر رکھ دینا دراصل کفر کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت سے کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ سیکولرزم کی بظاہر اس بے ضرر تعریف کو بھی نظری طور پر ایک فلسفے کی حیثیت سے قبول کرلے۔

رہا جمہوری نظام تو اسلام کسی ایسی جمہوریت کا سرے سے قائل ہی نہیں جس میں اقتدار اعلیٰ خالق کائنات کے بجائے بندوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہو اور جس میں اکثریت کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہے جس طرح چاہے زندگی جینے کے لئے اپنی پسند کا ایک نظام مرتب کرلے۔ اسلام میں شورائیت کا تصور جمہوریت سے مختلف ہے کہ وہاں شوری کا کام شریعت کے بنیادی فریم ورک میں کسی مخصوص صورت حال کے لئے ہدایات مرتب کرنا ہوتا ہے۔ جہاں بڑی سے بڑی اکثریت بھی شریعت کے بنیادی فریم ورک میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ جب کہ مغربی طرز کی جمہوریت جب چاہے اکثریت کے بل پر نئی شریعت ترتیب دے سکتی ہے۔ مروجہ جمہوریت دراصل بندوں پر بندوں کی حکمرانی کی ایک شکل ہے۔ اسلام بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی معبودیت میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ پھر کیا ہماری موجودہ جمہوریت شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ ہمارے بزرگوں نے اس سوال کو شرعی بنیادوں پر فیصل کرنے کے بجائے صرف یہ کہنا کافی سمجھ لیا کہ "جمہوریت کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اب ساری دنیا نے جمہوری نظام کو ضروری سمجھ لیا ہے" (ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی ج ۲ ص ۲۰۰)

سیکولر، لبرل قسم کے مسلمان ہوں یا ہماری دینی اور مذہبی قیادت، سیکولرزم کی تبلیغ میں ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش

میں ہے۔ عام بے شعور مسلمان یا اسلامی احکام سے غافل سیاست داں اگر اپنی ذاتی منفعت کی خاطر سیکولرزم کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ ان بے چاروں کو مسئلہ کی نزاکت کا اندازہ نہیں البتہ اگر معتبر علمائے کرام انہی ہی خیالات کے مبلغ بن جائیں تو سمجھ لیجئے کہ خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اپنی بات کے ثبوت کے لئے میں فی زمانہ ملک کے سب سے معتبر عالم دین مولانا ابوالحسن ندوی کی مثال پیش کر رہا ہوں جو بد قسمتی سے اس ملک کے معاشرے کو قرآنی بنیادوں پر منظم کرنے کے بجائے سیکولرزم کے اصولوں پر مستحکم کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"لیکن ہمارا ملک (ہندوستان) ایک وسیع اور عظیم ملک ہے یہاں کم سے کم ایسے تین پودے تھے جن کا باقی رہنا ضروری تھا اور ان کے ختم کر دینے سے اس ملک کے رقبہ

بعض دینی جماعتیں بھی اقامت دین کے بجائے اب سیکولر جمہوریت میں زیادہ کشش محسوس کرتی ہیں۔ البتہ ان کے یہاں اب تک یہ سب کچھ ایک وقتی اسٹریٹجی کے طور پر سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے

اور وسعت کے تناسب سے تین بڑے زہریلے سانپ نکل آئے ایک عدم تشدد (Non Voilence) کا پودا، دوسرا نامذہبیت (Secularism) کا پودا اور تیسرا جمہوریت (Democracy) کا پودا" (کارواں زندگی، ابوالحسن ندوی ج ۵ ص ۱۹۶)

آپ کے خیال میں اس ملک کی بقا اور سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یہاں عدم تشدد، نامذہبیت اور جمہوریت کو استحکام بخشا جائے اپنی ایک دوسری تقریر میں ان اصولوں پر زور دیتے ہوئے متنبہ فرمایا کہ "اگر سیکولرزم (نامذہبیت) عدم تشدد Non-Voilence کا پودا یہاں سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تو پھر تشدد اور مذہبی تعصب کا اژدھا نکل آئے گا۔ اور وہ کوئی رعایت نہیں کرے گا"۔ (کارواں زندگی ج ۵ ص ۱۵)

ایک ایسی فضا میں جہاں ہر طرف سیکولر جمہوریت کا سکہ چل رہا ہو اور عامۃ الناس میں اسے ایک بہتر قدر کی حیثیت سے اہمیت مل گئی ہو کم از کم معتبر علمائے دین سے تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں ان تصورات کا محاکمہ فرمائیں گے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے سب سے معتبر عالم دین نے بھی ان تصورات کا کتاب وسنت کی روشنی میں جائزہ لینے کے بجائے اس کی صحت کی سند کے لئے یہی کافی سمجھا کہ جلسے میں ان خیالات کو قبولیت حاصل ہوئی اور ملک کے مرکزی وزراء غلام نبی آزاد، سلمان خورشید اور مادھو راؤ سندھیا نے تائیدی تقریریں کیں۔

سیکولر جمہوری ہندوستان میں ابھی اس سوال کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا باقی ہے کہ مسلمان مسلمان رہتے ہوئے ان اجنبی تصورات کو کس حد تک قبول کر سکتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی سلامتی اور بقا کے لئے سیکولرزم، جمہوریت اور عدم تشدد کے اصولوں کو استحکام بخشنا لازمی ہے؟ کیا اسلام اس ملک کے مسائل کا حل نہیں پیش کر سکتا؟ کیا اسلام ملک کی موجودہ صورت حال میں اپنا Relevance کھو چکا ہے۔ اور کیا قرآن صرف مسلم اکثریتی ممالک کے لئے ہی رہنما اصول فراہم کرتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو قرآنی اصول کو یکسر لپیٹ کر رکھ دینے اور گاندھیائی اصولوں کے انطباق اور اس کے استحکام پر اتنا زور کیوں ہے؟

عام مسلمان ہی نہیں بلکہ ہمارے معتبر علماء اور دینی جماعتیں یہ سمجھنے لگی ہیں کہ ہندوستان جیسے بین الملی ملک کے نظام کو چلانے کے لئے سیکولرزم ہی کوئی قابل عمل متبادل پیش کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دینی جماعتیں بھی اقامت دین کے بجائے اب سیکولر جمہوریت میں زیادہ کشش محسوس کرتی ہیں۔ البتہ ان کے یہاں اب تک یہ سب کچھ ایک وقتی اسٹریٹجی کے طور پر سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ اس ملک کے لئے سیکولرزم ہی ایک قابل عمل سیاسی متبادل ہے مسلمانوں کے درمیان اب کوئی نیا خیال نہیں رہ گیا ہے۔ ہمارے معتبر علماء بہت پہلے اس نظریئے پر اعتبار کی مہریں ثبت کر چکے ہیں چنانچہ امت اسلامیہ ہند کے بطل جلیل مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی معروف کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھتے ہیں:

"جمہوریہ ہند کے سیکولر دستور میں تمام فرقوں اور قوموں کے مذہب اور کلچر اور عقیدہ کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس دستور کی نظر میں ملک کے مختلف فرقے اور آبادی کے مختلف العقیدہ عناصر برابر ہیں، یہ دستور ایک ایسے ملک کے لئے جہاں متعدد قومیں، مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے لوگ رہتے ہیں موزوں ترین دستور ہے" (ص ۱۸۶)

پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر جمہوریہ ہند کا سیکولر دستور "موزوں ترین" ہے تو پھر قرآن حکیم کا کیا Relevance باقی رہ جاتا ہے؟ اور اگر ہندوستان نے اپنی مخصوص صورت حال کے مطابق ایک موزوں ترین دستور تدوین دینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو پھر آسمانی ہدایات کی طرف کسی کو توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ حیرت ہے کہ ایک باخبر عالم دین ایک ایسے دستور کو جو حاکمیت الٰہ کے بنیادی تصور کی نفی پر ترتیب

دیا گیا ہو کیسے موزوں ترین دستور گردانتا ہے حالانکہ شریعت کی رو سے قرآنی دستور کے علاوہ کسی اور دستور حیات کو اعتبار بخشنا مسلمان کا ایمان ساقط کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ وہ قرآن کے منشور سے ذرہ برابر بھی انحراف کرے۔ کجا کہ کسی انسانی دستور کو قرآن کی موجودگی کے باوجود "موزوں ترین" دستور قرار دے۔ شریعت کی نظر میں یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

ملک میں حالات جتنے بھی خراب ہوں، مسلمانوں کی عملی زندگی جس قدر بھی منتشر ہو یہ معاملہ مسلمان کے بنیادی عقیدے سے تعلق رکھتا ہے کہ اس کی نظر میں زندگی جینے اور ہر صورت حال میں اجتماعی زندگی کا نظم و نسق چلانے کے لئے اگر کوئی دستور حیات ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ دوسرا دستور حیات اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے یا بعض حالات کی وجہ سے قابل قبول تو ہو سکتا ہے موزوں ترین نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی مسلمان اس بات کے لئے مکلف ہیں کہ وہ قرآنی نظام کے علاوہ کسی اور نظام حیات کے استحکام کے لئے جد و جہد کریں۔ بلکہ ایسا کرنا شریعت کی نظر میں انہیں گنہگار ٹھہراتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی سے پہلے بعض ان بنیادی سوالوں کے جواب فراہم کریں جس پر بوجوہ ہماری ملی اور دینی قیادت گزشتہ پچاس برسوں سے مداہنت کا شکار ہے۔ جب تک ایک بے تکلف سنجیدہ گفتگو کا آغاز نہیں ہوتا نظری طور پر کنفیوژن میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اگر بنیادی فطری مسائل میں کتاب و سنت کے حوالے سے گفتگو کا رواج بند کر دیا گیا تو عامۃ الناس ہی نہیں بلکہ دین و شریعت کے حاملین بھی پروپیگنڈے کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اور ایک ایسی ہی سنگین صورت حال پیدا ہو گئی جس سے آج ہم دوچار ہیں۔ کبھی ہم متحدہ قومیت کے اسیر ہو جاتے ہیں تو کبھی سیکولر ڈیموکریسی ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بے سمتی کے اس سفر میں ہم اس شعور سے یکسر خالی ہو چکے ہیں کہ ہمارے لئے کرنے کا کام کیا ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہم کس قرآنی ایجنڈے کے حامل ہیں۔

جب قیادت علیا ہی فکری کج روی کا شکار ہو، جب امت کی مخلص قیادت پر اجنبی خیالات نے اپنے پنجے سخت کر دیئے ہوں تو اس بات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے کہ کتاب و سنت کو اپنی فکر کا مرکز و محور بنایا جائے علماء سے وفاداری کو امت کی وفاداری پر ترجیح دیا جائے اور اللہ اور اس کے رسول سے وفاداری ملک سے وفاداری پر سبقت لے جائے۔

ملکی اور ملی وفاداری

عام انسانی زندگی میں جہاں فرد مختلف قسم کی وفاداریوں میں گھرا ہوتا ہے اسلام کا مطالبہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے وفاداری ہر قسم کی وفاداریوں پر سبقت لے جائے یہاں تک کہ اپنے قریبی رشتہ داروں، ماں باپ اور بال بچوں کی محبت کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر غالب آنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ کہہ دی گئی ہے کہ تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے اعزہ و اقارب اور ماں باپ سے کہیں زیادہ رسول سے محبت نہ کرتا ہو۔ خاندان ہو یا قبیلہ، ملک ہو یا وطن مومن کے لئے وفاداری کی فہرست میں یہ سب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر مختلف وفاداریوں میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ سے وفاداری کے مقابلے میں دوسری تمام وفاداریوں کو یکسر ٹھکرا دیا جائے۔ اب اگر مسلمان کے لئے دینی ملی وفاداری اسی قدر اہم ہے تو وطنی گروہی عصبیتوں کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ پھر متحدہ قومیت کا نعرہ ہو یا وطن پرستی کی دعوت یہ سب چیزیں اجنبی ایجنڈے کا حصہ قرار پاتی ہیں۔ لیکن گزشتہ پچاس برسوں سے ہم جس سیاست کے اسیر ہیں اور ہمیں جس قسم کی دینی قیادت میسر آتی رہی ہے اس نے ہمیں ایک

> حیرت ہے کہ ایک باخبر عالم دین ایک ایسے دستور کو جو حاکمیت الہ کے بنیادی تصور کی نفی پر ترتیب دیا گیا ہو کیسے موزوں ترین دستور گردانتا ہے حالانکہ شریعت کی رو سے قرآنی دستور کے علاوہ کسی اور دستور حیات کو اعتبار بخشنا مسلمان کا ایمان ساقط کر دیتا ہے

بین الاقوامی امت کی سطح سے بہت نیچے لا کر ایک وطن پرست گروہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے نتیجہ یہ ہیکہ ہم ہر لمحے خود کو ملکی اور ملی مفاد کے بیچ پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں ہماری اس کیفیت نے ہم سے حق گوئی و بے باکی کے جوہر بھی چھین لئے ہیں ملاحظہ کیجئے ہمارا ایک بالغ نظر عالم دین اس کیفیت میں اپنے آپ کو کس کشمکش سے دوچار پاتا ہے۔

"لیکن ہندوستان میں جو اپنی امن پسندی، انسانیت دوستی اور اہنسا کے لئے باہر کی دنیا میں مشہور تھا وہاں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو اس ملک کے نام کو بٹہ لگاتے ہیں۔ اور ملک سے باہر جانے والوں کو شرمندگی سے سر جھکا لینا پڑتا ہے میں آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ ۹ جنوری ۱۹۹۲ء کو میری ملک کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی سے دلی میں ملاقات ہوئی انہی تاریخوں میں مجھے اسلامی دنیا کی سب سے بڑی نمائندہ اور معزز تنظیم رابطہ عالم اسلامی واقع مکہ مکرمہ کی طرف سے جس کا میں فاؤنڈر ممبر ہوں دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور سفر کے سب انتظامات تھے میں نے جانے سے اس لئے معذرت کر دی کہ اگر ۶ دسمبر کے واقعہ اور اس کے بعد کے فسادات کا ذکر آیا اور مجھ سے سوال کیا گیا، تو میں کیا جواب دوں گا؟ جھوٹ بول نہیں سکتا سچ کہہ نہیں سکتا اس لئے میں نے نہ جانے کو ترجیح دی۔" (کاروان زندگی، علی میاں ندوی ج ۵ ص ص ۱۹۸-۱۹۷)

ملک سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ ملک میں حالات کتنے بھی خراب ہوں، مسلمانوں پر جو کچھ بھی گزرتی ہو، باہر کی دنیا میں اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے بلکہ یہ بتایا جائے کہ ہمارے ملک میں سب خیریت سے ہے۔ مسلمان بڑے امن و سکون کی زندگی جی رہے ہیں تاکہ بیرونی ممالک میں ہندوستان کی شہرت کو بٹہ نہ لگے لیکن امت سے وفاداری کا تقاضا تھا کہ اس ملک میں پیش آنے والی اذیت ناک صورت حال سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مطلع کیا جاتا کہ وہ دینی حوالے سے اس ملک کے مسلمانوں سے ایک جسد واحد کا تعلق رکھتے ہیں۔ گویا امت کا وسیع مفاد ملک کے مفاد سے براہ راست ٹکرا رہا تھا۔ اب دو وفاداریوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا ملک یا ملت، ہماری قوم پرست مذہبی قیادت نے اول الذکر کا انتخاب کر لیا۔

ہم ہر لمحے خود کو ملکی اور ملی مفاد کے بیچ پھنسا ہوا محسوس کرتے ہیں ہماری اس کیفیت نے ہم سے حق گوئی و بے باکی کے جوہر بھی چھین لئے ہیں

ایسا نہیں کہ ملک اور ملت کے مفاد میں یہ ٹکراؤ پہلی بار سامنے آیا ہو گزشتہ پچاس برسوں میں ملی اور ملکی مفاد میں قدم قدم پر ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوتی رہی ہے ہماری قیادت چونکہ ہمیں مسلسل وطن پرستی کا درس دیتی رہی ہے بلکہ بسا اوقات یہ باور کرانے کی کوشش ہوتی رہی ہے کہ ملی اور ملکی مفاد گویا ساتھ ساتھ چلتے ہوں۔ حالانکہ ایک ایسی دینی امت جو موجودہ وطن پرست معاشرے سے بالکل مختلف ایک دوسرا نظام برپا کرنا چاہتی ہو اس کا مفاد اس ملک کے مفاد سے ٹکرانا لازمی ہے جس کی ایک مثال ہم نے ابھی

ہم پہلے بھی یہ بات کہتے رہے ہیں کہ دستور اس ملک کو ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن بالکل مختلف سمت میں ایک مختلف نظام عدل کے قیام کا داعی ہے۔

ایک عالم دین کے کشش و پیچ کی کیفیت میں ملاحظہ کی۔ ابھی ہماری دینی قیادت کو صرف یہی فیصلہ نہیں کرنا ہے کہ ملکی اور ملی وفاداریوں میں کس وفاداری کو ترجیح دی جائے بلکہ ابھی تو اس مسئلے پر گفتگو ہونا باقی ہے کہ ایک متبادل دستور رکھنے والی امت کے لئے شریعت کی نظر میں مروجہ دستور کا کون کون سا حصہ قابل قبول ہے اور کون سا نہیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اس ملک کا باقاعدہ نظریاتی شہری ہونے کیلئے دستور میں کون کون سی بنیادی ترمیمات کی ضرورت ہوگی۔ مسلمان اس ملک میں اب تک نظری اعتبار سے اپنی حیثیت واضح نہیں کر پائے ہیں۔ ہم پہلے بھی یہ بات کہتے رہے ہیں کہ دستور اس ملک کو ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو قرآن بالکل مختلف سمت میں ایک مختلف نظام عدل کے قیام کا داعی ہے۔ دستور کا اصرار ہے کہ اس ملک میں سیکولر بنیادوں پر ایک متحدہ اور Common Civil Code کا معاشرہ قائم ہو تو دوسری طرف قرآن کا اس سے بھی کہیں شدت کے ساتھ مطالبہ ہے کہ اس ملک کے کارواں کا رخ قرآنی سول کوڈ کی طرف موڑ دیا جائے۔ اب مسلمانوں کو یا تو ان دو مطالبوں کے درمیان تطابق پیدا کرنا ہو گا اور اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو کسی ایک کو اپنے لئے منتخب کر لینا ہو گا۔ اسلام صرف افراد کو ہی قرآنی دستور حیات کا پابند نہیں بناتا بلکہ مسلم معاشرے اور مسلم حکومتوں سے بھی اس کا مطالبہ ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور دستور حیات کو اعتبار نہ بخشیں حتیٰ کہ قرآن کی رو سے کسی مسلم ملک کے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ یو این چارٹر کے Signatory کی حیثیت سے اقوام متحدہ میں اپنی شمولیت پر اصرار کرے مسلمان اور مسلمان حکومتیں ایک الہی چارٹر پر پہلے ہی دستخط کر چکی ہیں۔ اس لئے اب ان کے لئے کسی اور متبادل یا متضاد چارٹر پر دستخط کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

ملکی اور ملی وفاداری کی کشمکس نے بڑے بڑے اہل فکر کے حواس گم کر دیئے ہیں اگر ایک طرف ہندوستان میں مولانا اسعد مدنی اور ان کے متقدمین کو اس بات پر فخر ہے کہ "ملک سے غداری کرنے والے بہت سے ہندوستانی ملیں گے لیکن ہندوستانی مسلمان نہیں ملیں گے" (الجمعیۃ، تحفظ شریعت نمبر ۱۲ نومبر ۹۰، ص ۴۱) تو دوسری طرف پڑوسی ملک پاکستان میں ملکی وفاداری ملی وفاداری پر کچھ اس طرح غالب آئی ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے صاحب فکر پاکستان اور اس کے مستقبل کی فکر میں ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل سے یکسر لاتعلق محسوس کرتے ہیں۔ منیر کمیشن کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ اپنا دستور اپنے مذہب کے اصولوں پر بنائیں تو مولانا مودودی نے کہا کہ "یقینا" اور مجھے اس بات پر قطعی اعتراض نہیں ہوگا کہ اگر منو کے شاستروں کے مطابق ان کی حکومت میں مسلمانوں کو شودر اور ملیچھ کے طور پر رکھا جائے، اور انہیں حکومت کا حصہ دار بننے سے روکا جائے، اور بطور شہری انہیں کوئی حقوق نہیں دیئے جائیں"۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ جواب حسین احمد مدنی کے اس خیال سے کچھ مختلف نہیں ہے جب تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے انہوں نے صاف صاف اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اب ہم پر "پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی" اور یہ کہ "تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کر دیئے ہیں"۔ حالانکہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ ایک ایجنڈا رکھنے والی امت کا مفاد تقسیم نہیں ہو سکتا۔ پھر ملی وفاداری اور امت سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ مسلمان قومی یا علاقائی حد بندیوں سے آگے نکل کر امت کے وسیع تر مفاد میں کام کریں۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ خیال کہ انہیں ہندوستانی مسلمانوں کو شودر اور ملیچھ کا درجہ دیئے جانے پر کچھ اعتراض نہ ہوگا ملی اور ملکی وفاداریوں میں اسی ٹکراؤ کو ظاہر کرتا ہے جس میں ملکی وفاداری ملی وفاداری پر سبقت لے گئی ہے ورنہ ایک مسلمان کی غیرت کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کے ہم مذہبوں کے ایک قابل ذکر گروہ پر ذلت کی دردناک کیفیت طاری کر دی جائے اور اسے اس بات پر "قطعی اعتراض نہ ہو"۔ پاکستانی قوم پرستی کی یہ لے جسے اب اسلامی حوالے سے کسی قدر تقدس حاصل ہو گیا تھا، اتنی شدید تھی کہ یہ حقیقت بھلا دی گئی کہ ہندوستان شرعی اعتبار سے ایک سابق دارالاسلام تھا جہاں مسلمانوں کے لئے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ نئے نظام میں شودر اور ملیچھ کی حیثیت پر قناعت کر لیں۔

قومیت، وطن پرستی، سیکولرزم، ڈیموکریسی اور اس کے زیر اثر چھوٹے بڑے اجنبی تصورات نے ہمارے فکر میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنالی ہے کہ اب زندگی کے ہر موڑ پر کوئی فیصلہ لیتے ہوئے ہم خود کو مسلسل شش و پنج میں محسوس کرتے ہیں۔ جذباتی طور پر ہم نے اب تک اسلام کو سینے سے لگائے رکھا ہے، ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہمارے درد کا مداوا کر سکتا ہے

لیکن عملی زندگی میں رہنمائی کے لئے اس کی طرف رخ کرنے کا رجحان مفقود ہے۔ جذباتی طور پر تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام اس ملک میں ایک قرآنی نظام کا قیام ہے لیکن عملی طور پر ہماری ساری قوت موجودہ نظام کفر کو استحکام بخشنے میں صرف ہو رہی ہے۔ ہماری قابل ذکر اکثریت اب یہ سمجھنے لگی ہے کہ اس ملک میں ہمارا وجود اسی وقت تک باقی ہے جب تک سیکولر جمہوری نظام برقرار ہے حالانکہ پچاس سالوں کے تجربے نے ہمیں بار بار یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس نظام کے اندر رفتہ رفتہ ہم سے ہمارا سب کچھ کھویا جا رہا ہے۔

ان اجنبی تصورات کو شرعی بنیادوں پر جواز بخشنا تو مشکل ہے اس لئے ہمارے قائدین جب ان تصورات کی کھلم کھلا تبلیغ کرتے ہیں تو ان کی گفتگو سے شرعی اصطلاحات اور قال اللہ قال الرسول کا انداز یکسر غائب ہو

جاتا ہے۔ البتہ موجودہ صورت حال کو شرعی اعتبار بخشنے اور انہیں مسلمانوں کے درمیان قابل قبول بنانے کے لئے نئے تجدد پسند دانشوروں کا ایک گروہ ان دلائل کے ساتھ میدان میں آیا ہے کہ اب چونکہ دنیا مختصر ہو گئی ہے۔ لوگوں کی نقل مکانی کی وجہ سے معاشرے کا قدیم نظام کمزور پڑ گیا ہے اور دنیا کے بیشتر حصوں میں Plural سوسائٹی وجود میں آرہی ہے اس لئے اب نئے عہد میں مسلمانوں کو نئی صورت حال کا خیال رکھتے ہوئے لبرل جمہوری اقدار کے درمیان سے ہی راہ بنانی ہوگی۔ بظاہر جدید تجدد پسندوں کے ان دلائل میں وزن محسوس ہوتا ہے لیکن اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ ایک ایسی صورت حال نہیں ہے جو تاریخ میں پہلی مرتبہ پیدا ہو گئی ہو یقیناً دنیا ماضی کے مقابلے میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جہاں ایک تہذیب دوسری تہذیب پر مسلسل اثر انداز ہو رہی ہے، طاقتور تہذیبوں میں سبقت اور غلبے کے لئے ہر آن معرکہ برپا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی خطے میں انسانوں کے کسی گروہ کے لئے باقی دنیا سے یکسر لاتعلق ہو کر جینا اب خاصا مشکل ہو گیا ہے لیکن یہ ساری صورت حال اگر غالب تہذیب کے لئے مثبت عوامل کے طور پر کام کر سکتی ہے تو اسلامی تہذیب کے غلبے کے لئے اس صورت حال کو کیوں نہیں استعمال کیا جا سکتا ہے؟ پھر یہ کہ اگر تاریخ کے کسی مرحلے میں دنیا بھر میں ایسے معاشرے وجود میں آنے لگیں جہاں مسلم اقلیات کے مسائل غالب تہذیب کے گرداب میں آکر شدت اختیار کر لیں تو کیا صورت حال کی سختی اس بات کا جواز فراہم کر سکتی ہے کہ مسلمان قرآن کو لپیٹ کر رکھ دیں اور اسلامی نظام کے قیام کا ایجنڈا ملتوی کر دیا جائے

موجودہ ہندوستان میں جہاں اجنبی تصورات نے اسلامی فکری چوکھٹے میں اپنی جگہ کچھ اس طرح بنالی ہے کہ اب یہ سب کچھ مروجہ اسلامی فکر کا حصہ معلوم ہوتا ہے، کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ امت کو اجنبی تصورات کے طلسم سے نجات دلایا جائے اور یہ جبھی ممکن ہے جب ہم اپنے پچاس سالہ فکری سفر کا معروضی ناقدانہ جائزہ لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ □

تین فتوے: ایک سوال

مسلمانوں کو اب یہ فیصلہ کرلینا ہوگا کہ ان کا قائد کون ہے؟ ملائم یا محمد

ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ ایک آواز شاہی امام عبداللہ بخاری۔ اور شاہی امام کا قائد کون ہے؟ شری کانشی رام۔ ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ دوسری آواز، مولانا توصیف رضا خان بریلوی اور مولانا توصیف کا قائد کون ہے؟ شری کانشی رام ہندوستانی مسلمانوں کا قائد کون ہے؟ تیسری آواز، ملی کونسل کے قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور قاضی مجاہد الاسلام کا قائد کون ہے؟ شری ملائم سنگھ یادو۔

ایک سوال کے یہ تین مختلف جواب ہمیں تین مختلف فتووں سے حاصل ہوئے ہیں جو گزشتہ سال اتر پردیش میں اسمبلی انتخابات کے موقع پر امام جامع مسجد عبداللہ بخاری، بریلی شریف کے مولانا توصیف رضاخان اور ملی کونسل کے علماء کرام کے دستخطوں سے جاری ہوئے تھے ان فتووں کی چھوٹی تصویریں آپ کی سہولت کی خاطر ہم نے شریک اشاعت کرلی ہیں۔

فتووں کی اس بھیڑ بھاڑ میں عام مسلمان پریشان ہے کہ آخر وہ کیا کرے وہ کس کا کہا مانے اور کس کی رائے کو مسترد کرے ہر طرف جبہ و دستار والے لوگ اور تقدس والی شخصیتیں ہیں لیکن ان سب کے جواب الگ الگ ہیں۔ عام مسلمان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ان سبھی علمائے کرام کی ہدایت کا ماخذ ایک ہے تو آخر ان کے جوابات اتنے مختلف کیونکر ہیں پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں ہے اور ہماری مذہبی قیادت اتحاد کے سارے جتن کر لینے کے باوجود عملاً اس کے حصول میں ناکام ہے کسی معمولی شدبد رکھنے والے عالم دین سے

بھی پوچھیے تو وہ بتائے گا کہ اتحاد کے حصول کا نسخہ بڑا آسان ہے۔ اور وہ یہ کہ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولاتفرقوا" یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو" پھر آخر کیا وجہ ہے کہ یہ فتوے جاری کرنے والے حضرات اس سیدھی سی ترکیب کے استعمال سے عاجز ہیں کہنے کو تو مسلمانوں کے قائدین: جبہ و دستار والے معتبر علمائے کرام ہیں لیکن واقعہ یہ ہیکہ ان تمام حضرات نے اپنی قیادت کسی مشرک سیاسی قائد کے قدموں میں ڈال دی ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کے بجائے ان میں سے کسی نے ملائم سنگھ کی دم پکڑ رکھی ہے تو کوئی مایاوتی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہے۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کی قیادت پر علمائے کرام فائز ہیں لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لیجئے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بالواسطہ طور پر امت مسلمہ کی باگ ڈور کفار و مشرکین کے ہاتھوں میں آگئی ہے گویا انھوں نے Proxy لیڈر شپ کے ذریعے ہمیں اپنے کنٹرول میں لے رکھا ہے۔

ان فتووں میں جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو اقتدار سونپنے کا فیصلہ کتاب و سنت کے بجائے اپنے ذاتی رجحانات کی بنیاد پر کافی سمجھا گیا ہے۔ ان تینوں فتاووں میں دستخط کنندگان

یوپی کے ووٹروں کے نام آل انڈیا ملی کونسل کا پیغام

قومی آواز ۲/اکتوبر/۱۹۹۶ء

آل انڈیا ملی کونسل نے اپنے ۳۱/اگست و یکم ستمبر ۱۹۹۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والے چوتھے سالانہ اجلاس میں اترپردیش کی موجودہ سیاسی صورت حال پر غور کرتے ہوئے اپنے اعلانیہ میں کہا تھا کہ:

مسلمانوں کے ووٹ کو کوئی بھی سیاسی پارٹی اپنے حق میں طے شدہ تصور نہ کرے۔ مسلمان اس کے اہل ہیں کہ وہ ملت اور ملک کے مفاد کے پیش نظر خود فیصلہ کر سکیں۔ ووٹ دینا نہ صرف یہ کہ ہمارا حق ہے بلکہ ہمارا فرض بھی ہے۔ ہر قیمت پر ہمیں اپنا ووٹ اجتماعی فیصلے کے تحت استعمال کرنا چاہئے اور کسی بھی قیمت پر اپنے ووٹوں کو تقسیم نہیں ہونے دینا چاہئے اور ان تمام قوتوں اور ان کی چالوں سے چوکنا رہنا چاہئے جو ہمارے ووٹوں کو تقسیم کر کے ہمیں اس ملک کے میدان سیاست میں بے وزن کرنا چاہتی ہیں۔

آل انڈیا ملی کونسل کے اس اجلاس نے مرکز میں آنے والی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ:

"ملک میں بکھری ہوئی سیکولر اور جمہوری اقدار پر یقین رکھنے والی قوتوں کا یہ اتحاد جو مرکز میں وجود میں آیا ہے اور جس نے پارلیمنٹ کے فلور پر فرقہ پرست قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا ہے ملک کے مستقبل کے لیے فال نیک ہے۔"

آل انڈیا ملی کونسل کے اس اجلاس میں اترپردیش کے حالات پر نظر رکھنے اور بروقت مناسب فیصلہ کرنے کے لیے "کمیٹی برائے سیاسی امور اترپردیش" کی تشکیل کی تھی۔ اس کمیٹی نے مسلسل حالات پر نظر رکھی اور اترپردیش کے اکثر و بیشتر مقامات کے ذمہ دار حضرات سے رابطہ پیدا کیا نیز مختلف سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے بھی ان کے منشور، ان کے منصوبوں، اقلیتوں کے بارے میں ان کی پالیسیوں اور فرقہ پرست جماعتوں کے بارے میں ان کے رویے پر گفتگو کی۔

تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ کمیٹی تمام جمہوریت پسند ہندوستانی شہریوں کو یہ پیغام دینا ضروری سمجھتی ہے کہ:

۱۔ آنے والے انتخابات میں اترپردیش میں متحدہ محاذ کی کامیابی مرکز میں سیکولر طاقتوں کے اتحاد کو طاقت پہنچائے گی اور اس سے جمہوریت نیز سیکولرازم کے ذریعہ اپنے ملک کو صحیح خطوط پر لے چلنے پر مدد ملے گی ورنہ خطرہ ہے کہ فرقہ پرستی کا زہر پورے ملک میں امن و شانتی کو برباد کرے گا بلکہ ان اعلا قدروں کی موت کا بھی باعث بن جائے گا جو ہماری گنگا جمنی تہذیب و ثقافت، مذہبی غیر جانبداری اور باہمی رواداری کی بنیاد ہیں نیز دستور ہند کا بنیادی ڈھانچہ بھی شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔

۲۔ ہمیں اس پہلو پر بھی نگاہ رکھنی چاہئے کہ کچھ ایسی قوتیں بھی ہیں جو بظاہر سیکولرازم پر یقین رکھتی ہیں لیکن ماضی کا تجربہ بتاتا ہے کہ انھوں نے ملک کی جمہوری اور سیکولر اقدار کے انہدام میں حصہ لیا ہے اور ملک کو اخلاقی دیوالیہ پن کی موجودہ حالت تک پہنچانے میں ان کا کلیدی کردار رہا ہے اور کچھ ایسے بھی سیاسی گروپ ہیں جنھوں نے وقتی مفاد کے لیے ماضی میں فرقہ پرست قوتوں کا سہارا لیا اور اس طرح ان کو طاقت پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ ایسے سب لوگوں کے بارے میں بھی ہمیں چوکنا اور محتاط رہنا چاہئے۔

ان سب پہلوؤں پر نظر کر کے ہماری اپیل ہے کہ:

- آپ اپنا ایک ایک ووٹ ضرور استعمال کریں اور اپنا ووٹ اجتماعی فیصلے کے مطابق دیں۔
- کسی قیمت پر اپنے ووٹوں کا بٹوارہ نہ ہونے دیں۔
- اور کسی طرح کے ذہنی انتشار کا شکار نہ ہو کر مرکز کی طرح صوبائی انتخابات میں بھی متحدہ محاذ کی تائید کریں جس کی قیادت شری ملائم سنگھ یادو کر رہے ہیں۔

خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی (کنوینر کمیٹی برائے سیاسی امور اترپردیش) • **مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی** (سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل) • **مولانا سید کلب صادق** • **مولانا مجیب اللہ ندوی** • **مولانا عبداللہ مغیثی** • **مولانا ڈاکٹر علی محمد نقوی** • **ظفریاب جیلانی** • **ڈاکٹر نعیم حامد** (اراکین کمیٹی برائے سیاسی امور اترپردیش)

میں حضرت مولانا جیسے القاب و آداب کی کمی نہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان تمام حضرات نے مسلمانوں کے لئے کوئی سمت متعین کرتے وقت کتاب و سنت سے رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی کسی ایسے اسلامی حکم کا تذکرہ کیا جس کے مطابق مخصوص صورت حال میں کسی مخصوص سیاسی پارٹی کو اقتدار بخشنا اللہ اور اس کے رسول کا مطالبہ تھا۔ چنانچہ عبد اللہ بخاری صاحب اور مولانا توصیف رضا خاں سماجی انصاف کا معرکہ کانشی رام کی قیادت میں سر کرنا چاہتے ہیں۔ تو دوسری طرف قاضی مجاہد الاسلام ، سید کلب صادق ، مجیب اللہ ندوی اور خلیل الرحمان سجاد ندوی وغیرہ حضرات شری ملائم سنگھ کی قیادت میں " سیکولرزم کے ذریعہ اپنے ملک کو صحیح خطوط پر لے چلنے " پر مصر ہیں۔ ایک عام مسلمان سخت حیرت میں مبتلا ہے کہ آخر وہ کون سے " صحیح خطوط ہیں " جن پر ملائم سنگھ کی قیادت میں ہمارے علمائے کرام اس ملک کو لے جانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

گزشتہ پچاس برسوں میں امت پر جو نظریاتی زوال آیا ہے اور ہماری مذہبی قیادت نے اہم نازک مسائل پر جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے کبھی کبھی یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اب اس امت کے قائد محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نہیں بلکہ ملائم سنگھ یادو ہوگئے ہیں۔ اس لئے کہ اب ہمارے بہترین لوگ اس ملک کو محمدؐ کی قیادت میں ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر لے چلنے کے بجائے ملائم سنگھ جی کے سیکولر اصولوں پر اسے گامزن دیکھنا چاہتے ہیں

ہندوستانی مسلمانوں کے فکری بحران کو دیکھنا ہو تو الکشن کے موقع پر جاری ہونے والے مسلم قائدین کے بیانات پر نظر ڈالیں اور ان مہموں کے دوران کی جانے والی ان کی خطابت سے لطف اندوز ہو۔ نہ کسی کو یہ پتہ ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ کسی کو اس بات کا احساس کہ اپنی ہوا و ہوس اور ذاتی رجحان کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے لے کر وہ کس جرم عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے ان فتووں کی سطحیت اور ان میں پائی جانے والی خالص غیر دینی فکر اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ فی الواقع اس ملک میں مسلمانوں کے پاس کوئی دینی قیادت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولر فکر اور خیال کے افراد مذہبی حوالے سے ہماری دینی قیادت پر قابض ہوگئے ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ دین سے نابلد ایک عام سیاسی لیڈر کی رائے میں اور عمر بھر کتاب و سنت کا ورد کرنے والوں کے فیصلے میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اگر مستقبل کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو وہ صرف کتاب و سنت کے ذریعہ۔ کتاب و سنت کی موجودگی کے باوجود انہیں کسی مزید رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گمراہ کن فتووں پر اعتبار کرنے یا سیکولر ذہن رکھنے والے علماء سے رہنمائی کی توقع کرنے کے بجائے ہم اس رجحان کو رواج دیں کہ کسی خاص مسئلے پر اللہ کی کتاب کیا کہتی ہے اور اس بارے میں رسول اللہ کی سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے ورنہ ہوگا یہ کہ رسول اللہ ؐ کی نیابت کا دم بھرنے والی یہ امت عملاً کفار و مشرکین کی ہدایات کی اسیر ہو جائے گی۔ افسوس کہ بڑی حد تک ایسا ہو چکا ہے۔ اگر مسلمان ملک میں اپنے لئے کوئی روشن مستقبل چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ بلا تاخیر دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں۔ ملائم یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اپیل

بہوجن سماج پارٹی ملک کے اسّی فیصد کمزور، پسماندہ و مظلوم عوام اور دلتوں و اقلیتوں کی پارٹی ہے۔ اور یہی وہ واحد سیاسی جماعت ہے جو ملک کے کمزور طبقہ کو ظلم، ناانصافی، پچھڑے پن اور اقلیتوں خاص کر مسلم اقلیت کو فرقہ واریت اور آئے دن کے فسادات سے چھٹکارا دلا کر پرامن، خوش حال اور باوقار زندگی جینے کا حق دلا سکتی ہے۔

شری ملائم سنگھ یادو کی جھوٹی مسلم ہمدردی کا تجربہ کر چکے۔ مسلمانوں کی مسیحائی کا دعویٰ کرنے والے شری ملائم سنگھ یادو نے مسلمانوں کو جس طرح کٹوایا، لڑوایا، منتشر کیا اور بھاجپا کو متحد کر کے اس کی فرقہ واریت کو مزید بڑھاوا دے کر اسے طاقتور سے طاقتور بنایا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ شری یادو نے چند ہزار مسلموں کو اردو ٹیچر اور اردو مترجم بنا کر آگے کا دروازہ بند کر دیا اور اب نعرہ دیتے پھر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو عہدہ، کرسی اور حکومت میں حصہ داری نہیں چاہیئے بلکہ تحفظ چاہیئے۔ گویا وہ اس طرح انہیں مزید خوف و ہراس میں مبتلا کر کے انہیں اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح بھاجپائی فرقہ واریت اور اس کے ناپاک حوصلے کو اور بڑھاوا دے رہے ہیں۔

سنیکت مورچہ میں شامل تمام پارٹیوں سے آپ سبھی واقف ہیں اور ان کا تجربہ کر چکے ہیں۔ وہ کانگرس تیواری ہو یا جنتادل یا سماج وادی۔

آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ظلم، بھرشٹاچار اور فرقہ واریت سے جنگ کر کے انہیں ختم کرنے اور کمزوروں، مظلوموں اور اقلیتوں کو ان کا حق دلانے والی سیکولر جماعت کی حمایت کی جائے اور وہ ہے بہوجن سماج پارٹی۔

اگر مسلم اور دلت سیاسی طور سے متحد ہو جاتے ہیں تو مسلمان فرقہ واریت اور آئے دن کے فساد سے نجات پا سکتے ہیں۔

شری کانشی رام اور سو شری مایاوتی نے وعدہ کیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی، سماجی اور اقتصادی مسائل کی طرف بھرپور توجہ دے کر انہیں حل کیا جائے گا اور ان کی آبادی کے تناسب سے حکومت اور تمام شعبوں اور محکموں میں حصہ داری اور نمائندگی دی جائے گی۔

لہٰذا مسلمانوں سے خصوصی اپیل ہے کہ شری کانشی رام اور سو شری مایاوتی کے ہاتھوں کو مضبوط کریں اور بہوجن سماج پارٹی کو ووٹ اور حمایت دے کر صوبہ میں عوامی حکومت کا قیام کریں۔

مولانا محمد توصیف رضا خان

۲۸ ستمبر ۱۹۹۶ء — قومی آواز

بہوجن سماج پارٹی

منووادی نظام کو ختم کر کے انسانیت نواز اور مساوات پر مبنی معاشرے کا قیام کرنا۔

غنڈہ گردی، مافیا گردی، اور غیر سماجی عناصر کا خاتمہ کرنا۔

فرقہ واریت کو فروغ دینے والی طاقتوں کو اقتدار میں آنے سے روکنا۔

بے ترقی کے کاموں کو فروغ دینا

چناؤ نشان "ہاتھی" پر مہر لگائیں

"بہوجن سماج پارٹی" کو کامیاب بنائیں

مسلم نسل کشی کے پچاس سال

کیا ہندوستانی مسلمان خوف کی نفسیات سے باہر آسکیں گے؟

ہندوستانی مسلمانوں کی پچاس سالہ زندگی کا کوئی احتساب اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ فرقہ وارانہ فسادات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ لیکن ٹھہریئے، عام طور پر جسے فرقہ وارانہ فساد سمجھا جاتا ہے یا حکومت کی رپورٹیں، سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی تحقیقات اور اقلیتی کمیشن کے گوشوارے جسے فرقہ وارانہ فسادات باور کراتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں مختلف قومیں باہم دست بہ گریباں ہوتی ہیں۔ اگر یہ صورت حال سنگین نوعیت اختیار کرلے تو نسبتاً کم حوصلہ یا کمزور قوموں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا رہا ہے اس میں انہیں براہ راست حکومت کی منظم مشنری، پولیس اور فوج کے دستوں سے واسطہ پیش آتا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا دراصل حقیقت کو جھٹلانا ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی نسل کشی کے بڑے بڑے بازار جو تواتر اور تسلسل کے ساتھ سجتے رہے ہیں ان کی نوعیت محض فرقہ وارانہ فسادات کی ہے۔

جب پولیس کنٹرول روم سے جوانوں کو باقاعدہ یہ ہدایت مل رہی ہو کہ مسلمانوں کے گھروں کو جلائے جانے سے نہ روکا جائے اور ان تک کسی بھی قسم کی مدد نہ پہنچنے دی جائے۔ جیسا کہ مابعد انہدام فساد کے موقع پر بمبئی میں پیش آیا، یا جب مسلم نوجوانوں کو باقاعدہ ٹرک میں بھر کر پولیس کے جوان یکے بعد دیگرے ان کو گولیوں کا نشانہ بنا کر نہر میں پھینک کر جلد از جلد اپنا کام نمٹانا چاہتے ہوں جیسا کہ ملیانہ اور ہاشم پورہ کے واقعات سے ثابت ہے یا جب پولیس کی امان میں مسلمان بچوں اور عورتوں سے بھری بس کو آگ لگا دی جاتی ہو جیسا کہ جمشید پور میں پیش آیا، یا نہتے نمازیوں پر منظم پولیس زور وشور سے فائر کا دہانہ کھول دیتی ہو جیسا کہ مرادآباد میں عید کے دن پیش آیا، تو ان صورت حال کو محض فرقہ وارانہ فساد کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کو مسلسل ریاستی دہشت گردی کا سامنا رہا ہے۔ ان کا مقابلہ مختلف سطحوں پر منظم پولیس اور پارا ملٹری فورسز سے ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فساد کے بعد جانی مالی نقصانات اور پولیس حراست میں جھوٹے مقدمات بھی مسلمانوں کے حصے میں دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ آئے ہیں۔ کبھی یہ ریاستی دہشت گردی غیر منظم طریقے سے پولیس کے ذریعہ انجام پاتی ہے تو کبھی قوانین کا سہارا لے کر ٹاڈا جیسے سیاہ ایکٹ کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس کی اذیت بڑی حد تک صرف مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ملک بھر میں اتنے بڑے پیمانے پر فسادات کون کراتا ہے اور یہ کہ اس کے پیچھے اصل مقصد کیا ہے۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اب دور دور تک بھی پاکستان کی طرف ہجرت کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہندو احیاء پرستوں کا یہ نعرہ کہ "مسلمانوں کے لئے دو استھان، پاکستان یا قبرستان" عملی طور پر ممکن نظر نہیں آتا۔ پھر فسادات کرانے والے آخر چاہتے کیا ہیں۔ فسادات کی تھیوری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور عام طور پر یہ

سمجھا جاتا ہے کہ فسادات ان شہروں میں برپا ہوتے ہیں جہاں مسلمان معاشی طور پر یا تو مستحکم ہو گئے ہیں یا تجارت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا مقابلہ مقامی تاجروں سے ہوتا ہے۔ اور مقامی ہندو تاجر چونکہ ان ابھرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں اس لئے وہ مقامی غنڈوں اور زہریلے دماغ کے ہندوؤں کی مدد سے فساد برپا کرتے ہیں تاکہ مسلم تاجروں کو ایسا سبق/سکھایا جائے کہ پھر وہ بہت دنوں تک مسابقت کے لائق نہ رہیں۔ یقیناً اس تجزیئے میں جزوی صداقت موجود ہے۔ البتہ اگر فسادات صرف ان مقامی تاجروں کی رسہ کشی کا نتیجہ ہوتے تو ان کا دائرہ کار بھی چند شہروں یا قصبات تک محدود ہوتا۔ پھر ملک گیر سطح پر فسادات کے برپا ہونے کی آخر وجہ کیا ہے؟ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک بھر میں جس شدت کے ساتھ فسادات بھڑک اٹھے اس سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف حکومتی سطح پر کوئی خاموش پالیسی پائی جاتی ہے۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسجد کے انہدام کے بعد ایک مظلوم اور بے بس قوم پر ملک بھر میں حکومت کی مشینری بلادریغ فائر کے دہانے کھول دے۔ سوال یہ ہے کہ اگر فسادات اور نسل کشی کے ان واقعات سے مسلمانوں کا وجود اس ملک سے ختم ہونا ممکن نہیں تو آخر نسل کشی کے پالیسی ساز اس بربریت سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔؟

بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک بھر میں جس شدت کے ساتھ فسادات بھڑک اٹھے اس سے بھی اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ملک بھر میں مسلمانوں کے خلاف حکومتی سطح پر کوئی خاموش پالیسی پائی جاتی ہے۔

حکومتی پالیسی سازوں اور ہندو احیاء پرستوں کو مشترکہ طور پر مسلمانوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ مسلمان اس ملک میں اپنے عزائم سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور یہ بھول جائیں کہ کبھی وہ اس ملک میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مسلمانوں کو ان کے عزائم سے دست بردار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان پر مسلسل خوف کی کیفیت طاری رکھی جائے۔ انہیں ہر لحمہ اپنی جان و مال کے تحفظ کا خوف ہو، ماں بہنوں کی آبرو لٹ جانے کا ڈر ہو اور ہر لحمہ انہیں ایسا لگتا ہو کہ کوئی خطرناک بات زبان سے نکلنے پر کسی بھی لحمہ ان کی زندگی کا چراغ گل ہو سکتا ہے۔ تحفظ کی زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ایک سمجھ دار اقلیت کی حیثیت سے ہمارے رحم و کرم پر جینا قبول کرلیں۔ اور یہ کہ تحفظ کے لئے بار بار انہی باتوں کا حوالہ دیں جو ہم نے ان سے کی ہیں۔ دیکھا جائے تو مسلمانوں کو خوف کی نفسیات سے دوچار کرنے میں ہمارے پالیسی ساز خاصے کامیاب رہے ہیں۔ ہم مسلمانوں کی قابل ذکر اکثریت صرف اپنی جان و مال کے تحفظ کی فکر میں مصروف ہے۔ اسے بڑی باتیں کرنے یا اہم مسائل پر غور و فکر کے لئے فرصت ہی کب ہے۔

Ken Kesey کے ناول One Flew Over the Cuckoo's Nest میں کمیونزم کے جبر کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک سرپرس ذکر کیا گیا ہے جس کے خوف سے ہاسپیٹل کے سارے مریض کانپ جاتے ہیں سرپرست نرس کا تذکرہ آتے ہی سبھی کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ سبھوں کو اس نرس سے خوف بھی ہے لیکن معاملہ جب آزادی کے حصول کا آتا ہے یا جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اس نرس کی سرپرستی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا جائے تو ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ آخر وہ آزاد ہو کر جائے گا کہاں، جیسا بھی ہے بھلا یا برا اس جبر تلے زندگی تو بسر ہو رہی ہے۔ خوف کا یہ عالم ہے کہ نظام جبر سے نکلنے میں بھی خوف آتا ہے۔ معلوم نہیں آگے کیا ہو کچھ یہی حال ہندوستانی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے ارد گرد خوف نے کچھ اس طرح اپنا گھیرا تنگ کر لیا ہے کہ انہیں اس صورت حال سے نکلتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔ انہیں اس نظام جبر سے حد درجہ شکایت ہے۔ لیکن وہ ان شکایتوں کو بھی اس نظام جبر سے فدویانہ

درخواستوں کے ذریعہ حل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولر ڈیموکریسی کے ہاتھوں مسلسل زخم کھانے کے باوجود وہ بار بار اسی سیکولر ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے عرض گزارتے ہیں۔

فسادات چھوٹے ہوں یا بڑے اس کی پلاننگ ہندو احیاء پرست کرتے ہوں یا حکومت کے پالیسی ساز ادارے۔ ان سب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں پر خوف کے ماحول کو مزید گہرا کیا جائے اور اسے مزید طول دیا جائے۔ ورنہ اگر مسلمانوں کو اپنی صحیح عددی قوت کا اندازہ ہوگیا اور خوف کی نفسیات سے نکل کر ان کے قائدین نے مستقبل کی منصوبہ بندی کا کام شروع کر دیا تو قوت کے موجودہ میزانیے میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو جائے گی۔ مسلمانوں کو خوف کی نفسیات سے دوچار کرنے کا یہ منصوبہ آزادی سے بہت پہلے مرتب کیا گیا تھا۔ جس پر کمال عیاری کے ساتھ اس وقت کے غیر مسلم قائدین نے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی تھی یہ سب کچھ کیسے ہوا ایک طویل داستان ہے۔ البتہ ہم یہاں اشارۃً صرف اتنا کہنا چاہیں گے کہ خلافت تحریک میں مسلمان ایک فیصلہ کن قوت کی حیثیت سے ہندوستان کے مستقبل کے فیصلے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن 1935 کے بعد ان کی ساری سرگرمیوں کا مرکز مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ بن گیا اور اس مقصد کی خاطر ایک الگ ملک کا مطالبہ بھی سامنے آگیا۔ تاریخ کی کمان مسلمانوں کے ہاتھوں سے کس طرح پھسلتی گئی اس کا ذرا اندازہ کیجئے۔ 1707 میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی جس کی حکومت اس ملک میں قوت اسلامی کا علامیہ سمجھی جاتی ہے۔ 1857 میں مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہوگیا۔ ٹھیک ۹۰ سال بعد 1947 میں جب انگریز اقتدار کی منتقلی کا فارمولہ ترتیب دے رہے تھے مسلمانوں کے ذہن پر جو چیز سب سے زیادہ حاوی تھی وہ یہ کہ انگریز جانے سے پہلے ان کے تحفظ کا کام کر جائے۔ قرارداد پاکستان سے پہلے اور بعد میں

ہندو احیاء پرستوں کو مشترکہ طور پر مسلمانوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ مسلمان اس ملک میں اپنے عزائم سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور یہ بھول جائیں کہ کبھی وہ اس ملک میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

بھی کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ انگریزوں نے اس ملک کا اقتدار جن ہاتھوں سے لیا تھا جاتے وقت انہی ہاتھوں اقتدار منتقل کرنا چاہئے تھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ مسلمان خوف کی نفسیات میں اس بری طرح مبتلا ہوگئے کہ انہیں اپنے ہی ملک میں اپنی حفاظت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ بقول ابوالکلام آزاد انہیں اپنے سائے سے ڈر لگنے لگا۔ ظاہر ہے کہ جب پوری قوم پر خوف کا حملہ ہو، قویٰ مضمحل اور ہمتیں جواب دے چکی ہوں۔ ایسی صورت حال میں وہ قوموں کی سیادت کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ اسے تو صرف اس بات کی فکر تھی کہ ہماری جان و مال کے تحفظ کا انتظام ہو جائے۔ خواہ ایسا ملک کے ایک چھوٹے سے حصے ہی میں کیوں نہ ہو۔ اور خواہ اس کے لئے اسلاف کی دلی کو کیوں نہ خیرباد کہنا پڑے۔
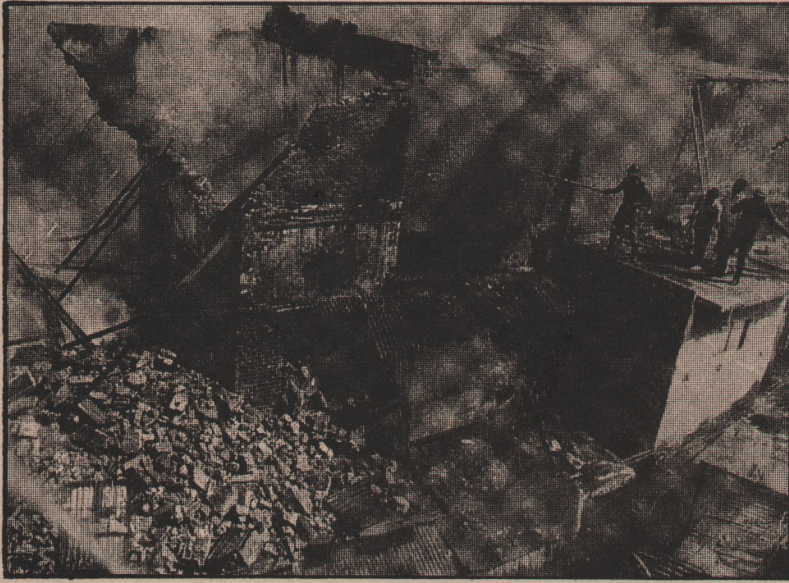
تقسیم ہند کے بعد حکومت کے وہ پالیسی ساز جو ملک میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پاکستان کے بجائے ایک بڑا پاکستان بن جانے پر اطمینان کا سانس لے رہے تھے انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ پاکستان بن جانے کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہذا تقسیم کے ابتدائی دنوں میں عین حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کی جان و مال پر حملے شروع ہوگئے۔ جس کا تذکرہ مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں جا بجا کیا ہے۔ ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جس پر گاندھی جی بھی خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ اس سارے

پچاس سالہ مسلم نسل کشی

(ایک نامکمل جدول)

سال	فسادات کی تعداد	مقتولین	دائرہ اثر
۱۹۴۷			
		۵۰۰۰۰۰	شمالی ہند
۱۹۴۸			
		۲۰۰۰۰۰	
۱۹۵۰	۵۶۴		
		۲۰۰۰	بنگال
۱۹۶۰	۲۶۸۹		
		۳۱۲۶	بہار / گجرات
۱۹۶۱	۹۲		
۱۹۶۲	۶۰		
۱۹۶۳	۶۱		
۱۹۶۴	۱۱۷۰		
۱۹۶۵	۶۷۶		
۱۹۶۶	۱۳۳		
۱۹۶۷	۲۲۰		
۱۹۶۸	۳۴۶		
۱۹۶۹	۵۱۹		
۱۹۷۰	۵۲۱		
۱۹۷۱	۳۲۱		
۱۹۷۲	۲۳۰		
		۷۰	
۱۹۷۳	۲۴۲		
		۷۲	
۱۹۷۴	۲۴۸		
		۸۷	
۱۹۷۵	۲۰۵		
		۳۳	
۱۹۷۶	۱۶۹		
		۳۹	
۱۹۷۷	۱۸۸		
		۳۶	
۱۹۷۸	۲۳۰		
		۱۱۰	
۱۹۷۹	۳۰۴		
		۲۶۱	
۱۹۸۰	۳۲۷		
		۳۷۵	
۱۹۸۱	۳۱۹		
		۱۹۶	
۱۹۸۲	۳۰۹		
		۱۱۸	
۱۹۹۱-۹۲	۴۳۰۰		
		۳۳۵۰	ملک بھر میں
۱۹۹۳	۲۲۹۲		
		۹۵۲	خصوصاً ممبئی / سورت
۱۹۹۴	۱۷۹		
		۷۸	
۱۹۹۵	۹۹ (جون تک)		
		۳۶	

مکمل اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ ہم نے مختلف آخذ کو سامنے رکھ کر یہ جدول تیار کیا ہے جن میں پارلیمانی استفسارات اور وقتاً فوقتاً سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے شایع ہونے والی رپورٹیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اقلیتی کمیشن، نیشنل انٹگریشن کاؤنسل اور وزارت داخلہ کی سالانہ رپورٹیں بھی شامل ہیں۔ بعض مشمولات مسلم انڈیا اور بزنس اسٹینڈرڈ سے بھی لئے گئے ہیں۔

ہنگامے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے عزائم پست ہو جائیں۔ اولاً وہ یا تو اس ملک سے ہجرت کر جائیں ثانیاً اگر وہ رہنا بھی چاہیں تو ہمارے رحم و کرم پر فدویانہ اور ملتجیانہ انداز سے زندگی گزاریں تاکہ مستقبل میں مسلم سیاسی قوت کے احیاء کا کوئی امکان نہ رہے۔ تب سے اب تک فرقہ وارانہ فسادات کے نام پر مسلمانوں کے حوصلوں کو پست رکھنے اور ان کو خوف کی نفسیات میں بتلا رکھنے کا کام جاری ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک جن علاقوں میں کثرت سے فسادات ہوئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فسادات کا بنیادی مقصد خوف کا ماحول طاری کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہر فساد میں ایک نئی وحشتناک اسٹریٹیجی بروئے کار لائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بمبئی کے مابعد انہدام فسادات میں مسلمانوں کے ان طبقوں کو نشانہ بنایا گیا جو مال و دولت یا مناصب کی وجہ سے اب تک خود کو محفوظ تصور کرتے تھے۔ لہٰذا وہ لوگ بھی جو فسادات میں غریب مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہمدردی کے دو بول کہہ دیتے تھے انہیں بھی اتنا خوف زدہ کیا گیا کہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے اداکار اور اداکارہ عام مسلم جلسوں میں پھوٹ پھوٹ کر روتے نظر آئے۔ حیدر آباد میں کرکٹ کیپٹن محمد اظہرالدین کے گھر پر حملہ کیا گیا اور دلی یونیورسٹی کے معروف کمیونسٹ پروفیسر مونس رضا کو کیمپس چھوڑ کر پرانی دلی میں پناہ لینی پڑی۔ راہی معصوم رضا جنہیں مہابھارت کی ٹی وی کہانی لکھنے کا اعزاز حاصل ہے ان کی اہلیہ پناہ کی تلاش میں بھنڈی بازار کے علاقے میں نظر آئیں۔ اور شبانہ اعظمی جب جے این یو کے ایک جلسے میں اپنی داستان سنانے کھڑی ہوئیں تو اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سورت میں مسلمانوں کا مورال پست کرنے کے لئے مسلم خواتین پر ظلم کا ایک نیا باب رقم کیا گیا۔ مسلمان غریب ہوں یا امیر، جاہل ہوں یا پڑھے لکھے۔ سرکار دربار سے ان کا تعلق ہو یا نہ ہو اس بات کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی ہے کہ انہیں خوف اور بے بسی کی کیفیت میں بتلا رکھا جائے۔ یہ کسی طرح اس پوزیشن میں نہ ہوں کہ اپنے طور پر کچھ سوچ سکیں

گزشتہ پچاس برسوں کے فرقہ وارانہ فسادات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ان فسادات میں ایک تسلسل کا پتہ چلتا ہے۔ 1961 کے جمشید پور، جبل پور اور راوڑ کیلا کے فسادات پر 64ء کے فسادات کیفیت کے اعتبار سے سبقت لے جاتے ہیں۔ 67 میں رانچی کا فساد مسلمانوں کو یہ سبق سکھاتا ہے کہ وہ اپنی زبان کے تحفظ کا خواب ترک کر دیں اور 69ء میں احمد آباد کا فساد ان کے اندر سخت احساس محرومی اور بے بسی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ 76ء میں ترکمان گیٹ کا قتل گویا اس بات کی وضاحت ہے کہ مرکز کے اہم عہدیداران کی نظروں میں مسلمانوں کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ 1980 کے مراد آباد کے فساد سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کا بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہونا، خواہ ایسا کرنا عید کی نماز کے لئے ہی کیوں نہ ہو، تحفظ کے نقطہ نظر سے انتہائی خطرناک ہے۔ 83ء میں نیلی (آسام) میں ایک وحشیانہ رسم کے ساتھ قتل عام کا بازار لگایا جاتا ہے تو 84ء میں بھیونڈی میں نئے ابھرتے مسلم تاجروں سے ان کا اعتماد چھین لیا جاتا ہے۔ 87ء میں میرٹھ کے واقعات ان سب پر بازی لے جاتے ہیں پھر بھاگلپور کا واقعہ ہے اور اس کے بعد ایڈوانی کی رتھ یاترا کے جلو میں چھوٹے بڑے فسادات کا ملک بھر میں ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو بالآخر بابری مسجد کے انہدام پر منتج ہوا اور جس کے بعد پورا
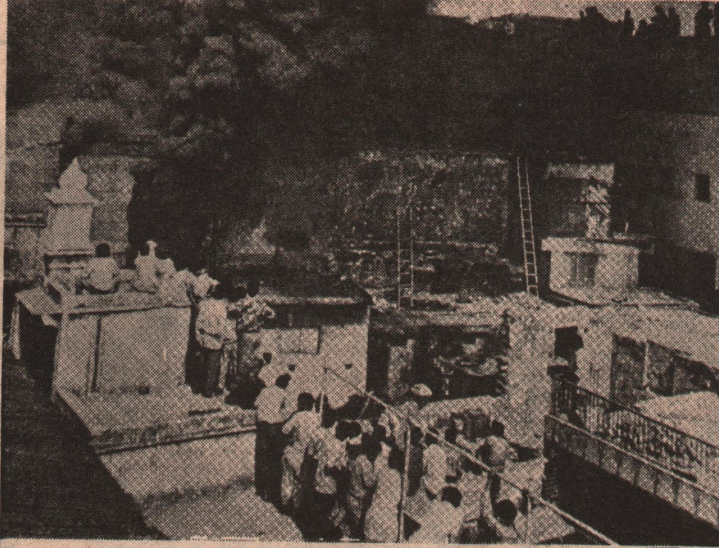
قرارداد پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ انگریزوں نے اس ملک کا اقتدار جن ہاتھوں سے لیا تھا جاتے وقت انہی ہاتھوں اقتدار منتقل کرنا چاہتے تھا۔

ملک کئی ہفتوں تک مقتل بنا رہا ان تمام فسادات میں ایک بات جو مشترک نظر آتی ہے وہ یہ کہ ہر موقع پر خوف زدہ کرنے کے لئے نئے نئے طریقے اپنائے جاتے ہیں کہیں مسلمان بہنوں کی آبرو ریزی ہے تو کہیں نوجوانوں کا قتل، کہیں مسلمانوں کے بااثر حلقوں کو خوف زدہ کرنے کی

مسلمان غریب ہوں یا امیر، جاہل ہوں یا پڑھے لکھے۔ سرکار دربار سے ان کا تعلق ہو یا نہ ہو اس بات کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی ہے کہ انہیں خوف اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا رکھا جائے۔

کوشش ہے تو کہیں حکومت کی طرف سے یہ تاثر عام کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی حفاظت کا کام ایک واقعتا سیکولر حکومت ہی انجام دے سکتی ہے اور جس کے بہت سے دعویدار اس ملک میں پہلے ہی سے موجود ہیں

قوانین نافذ کرنے والے حکومت کے اعلی عہدیدار اور پالیسی ساز اس مسئلے پر واقعی کس طرح سوچتے ہیں اس کا بہت کچھ اندازہ ذیل کے ان اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً غیر مسلم اہل قلم نے لکھے ہیں۔

"۱۱ اور ۱۲ اپریل فساد کے ابتدائی دو دنوں میں بہار پولیس اور ریاستی دستوں کو کھلی چھوٹ ملی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہار ملٹری پولیس کی کمان کسی آر ایس ایس آفیسر کے ہاتھ میں ہو۔ فساد کے شروع ہونے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد بی ایم پی حرکت میں آ گئی۔ وہ مسلمانوں کی بستیوں میں اس طرح داخل ہونے لگے جیسے انہیں چن چن کر نشانہ بنا رہے ہوں۔" (اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی ۱۹ مئی ۱۹۷۹ء، ص ۸۷۰)

"حتی کہ آج بھی اعلی عہدوں پر فائز بہت سے ہندو مسلمانوں کو ممکنہ پاکستانی تصور کرتے ہیں کوئی ربع صدی پہلے جب میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہمیں حکومت سے جو خفیہ ہدایات ملتی تھیں ان میں کہا جاتا تھا کہ امن وامان کے درہم برہم ہونے کی کسی بھی نازک گھڑی میں مسلمانوں پر خاص نظر رکھی جائے۔ بلکہ اگر ضروری معلوم ہو تو ان کے لائسنس یافتہ ہتھیار بھی ضبط کرلئے جائیں جب کہ ممکنہ ہندو فسادیوں کے بارے میں ایسی کوئی ہدایات نہیں دی جاتی تھیں"

(ایم این بچ، انڈین ایکسپریس ۱۳ دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۵)

"پولیس نے انتہائی منصوبہ بند طریقے سے مصطفی اور عثمانی مسجد کا محاصرہ کرلیا جو شمالی مشرقی دہلی میں ہے اس نے لوگوں پر گولیاں چلائیں۔ انہیں مار ڈالا۔ انہیں دہشت زدہ کیا اور نمازیوں کو اذیت پہنچائی۔ منظم گروہوں نے دو طرف سے حملہ کیا۔ تیسری طرف سے پولیس آگئی جس نے قتل لوٹ مار اور عورتوں کی آبروریزی کا سلسلہ شروع کردیا۔ مختصر یہ کہ یہاں ایک طرف مسلح پولیس تھی تو دوسری طرف بے بس مسلمان"

(ڈاکٹر انوپ سرایا، ریڈینس ۱۷۔ ۲۳۔ جنوری ۱۹۹۳)

"جو کچھ میں نے دیکھا اس کی بنیاد پر پہلا تاثر تو یہی قائم ہوتا ہے کہ پی اے سی نے مسلمانوں کی گھنی آبادیوں والے علاقے میں بہت سے مسلمان مردوں کو بلاوجہ قتل کیا ہے۔ میں نے عورتوں اور بچوں سے ملاقاتیں کیں، وہ سب غم سے ٹوٹے جاتے تھے، میرے لئے اپنے آنسو روکنا مشکل ہوگیا۔ بہت سے نوجوان لیکن سب کے سب مسلمان، سب کے سب غریب اور نہتے۔ ان سبھوں کو پی اے سی نے ان کے گھروں سے نکال کر مار ڈالا۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کی تعزیت کیسے کی جائے، جو مارے گئے وہ بے گناہ تھے، پولیس کی زیادتی کا شکار ہوئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فرقہ وارانہ جھڑپوں اور جھڑپوں پر قابو پانے کے لئے پولیس کے ایکشن میں آجانے کی وجہ سے یہ قتل نہیں ہوئے۔ میں نے وہ دردناک کہانیاں سنی ہیں کہ کس طرح پولیس والوں نے لوگوں کو ان کی جھونپڑیوں سے نکال نکال کر مارا۔۔۔ میں نے کلکٹر سے پوچھا کہ کیا کوئی ہندو بھی مارا گیا ہے کہ اگر یہ فرقہ وارانہ فساد ہوتا تو ایسا ہونا ضروری تھا۔ میں نے مسلم علاقوں میں جاکر ہندوؤں سے پوچھا، وہ گھنی مسلم آبادی کے علاقوں میں محفوظ تھے، تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مارے جانے والے سب کے سب ایک ہی فرقے کے لوگ تھے اور درد کے مارے یہ لوگ جن جگہوں پر آباد تھے وہاں اکا دکا ہندو بھی پوری طرح محفوظ تھا"
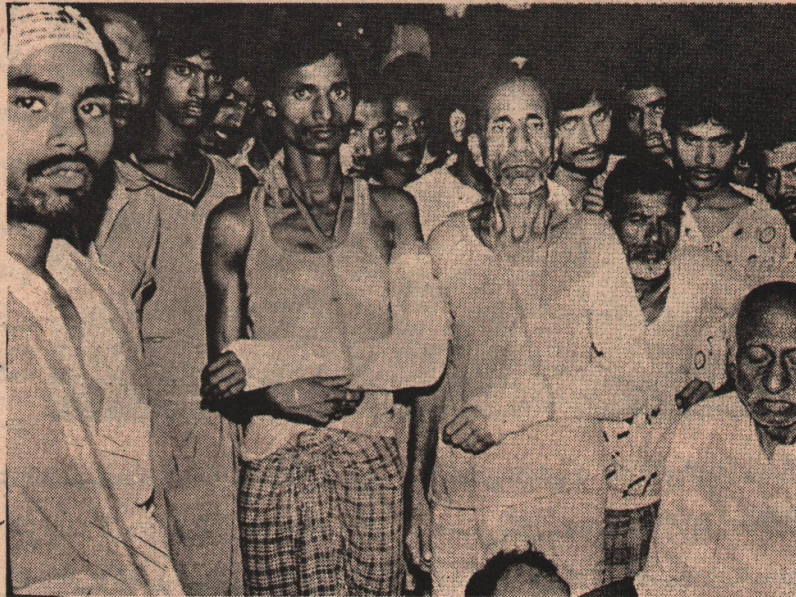
(وی آر کرشنا آئیر، سابق جج سپریم کورٹ، مکتوب بنام وزیر داخلہ ۱۱ نومبر ۱۹۸۲ء)

یہ اور اس قسم کے بے شمار اقتباسات اس بات پر دال ہیں کہ اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے نام پر جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ دراصل ریاستی دہشت گردی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک بھر میں پیش آنے والے دردناک واقعات پر ہندو صحافیوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اس سے بھی

اس تھیوری کو تقویت ملتی ہے۔ اب اگر کسی وجہ سے حکومت کی مشنری میں ایسے لوگ گھس آئے ہوں جو مسلمانوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں یا یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے نتیجے میں ہو بہر حال مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ خوف کی نفسیات میں مبتلا رکھنے کی اس کوشش کا سد باب کیسے کیا جائے۔ کہ جب تک امت خوف کی صورت حال سے باہر نہیں نکلتی کسی بڑے انقلابی منصوبے کو کسی عوامی تحریک کا حصہ بنانا ممکن نہیں ہوسکتا۔

ملک بھر میں فسادزدہ علاقوں کی ایک اجمالی فہرست

(۱۹۴۷ء۔ ۱۹۹۷ء)

ریاست	علاقے
آندھرا پردیش	عادل آباد، حیدر آباد، کریم نگر، کرنول، میڈک، نلگنڈا، نظام آباد، رنگاریڈی
آسام	کچھار، درانگ، گول پارہ، کام روپ، نوگونگ
بہار	بھاگلپور، بھوجپور، چمپارن (مغربی و مشرقی) دربھنگہ، گیا، گریڈیہ، گوپال گنج، ہزاری باغ، مدھوبنی، مونگیر، نالندہ، پٹنہ، پورنیہ، رانچی، سنتھال پرگنہ، سیوان، سنگھ بھوم اور سیتامڑھی۔
دہلی	سنٹرل دہلی، مشرقی دہلی، شمالی دہلی
گجرات	احمد آباد، بڑودا، بانس کنٹا، بھروچ، جام نگر، جوناگڑھ، کھیدا، پانچ محل، سابر کنٹھا اور سورت
کیرالہ	کنانور، ملام پورم، ٹریچوی، تریوندرم
کرناٹک	بنگلور، بیدر، دھارواڑ، گلبرگہ، کولار، بیسور، ساؤتھ کنارا
مدھ پردیش	بھوپال، چھندواڑہ۔ داموہ، جبل پور، کھنڈوا، کھارگون، منڈسور، رائے گڑھ، راج گڑھ، رائے سن، رتلام، ساگر، سیہور، سیونی، شاجاپور، اجین اور ودیشا۔
مہاراشٹر	احمد نگر، آکولا، امراوتی، گریٹر بمبئی، بلڈانہ، ناسک، پربھنی، پونے اور تھانے
اڑیسہ	بالاسور اور کٹک
راجستھان	بھلواڑہ۔ چتور گڑھ، جودھ پور، جے پور، کوٹہ، ناگپور، پالی، اودے پور،
تامل ناڈو	آرکوٹ (شمال و جنوب) کوئمبٹور، دھرما پور، مدورائی، رمنتا پورم، تیرونلویلی، ٹریچی،
یوپی	آگرہ، علی گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بدایوں، بہرائچ، باندا، بارہ بنکی، بریلی، بستی، بجنور، بلند شہر، دیوریا، فیض آباد، فتح پور، غازی آباد، غازی پور، گونڈہ، گورکھپور، جون پور، کان پور، لکھنؤ، متھرا، میرٹھ، مراد آباد، مظفر نگر، نینی تال پیلی بھیت، پرتاپ گڑھ، رائے بریلی، رام پور، سہارنپور، شاہ جہاں آباد، سیتاپور، وارانسی،
مغربی بنگال	کلکتہ، مرشد آباد، ندیا، ۲۴ پرگنہ

تحفظ شریعت سے نفاذ شریعت تک

شاہ بانو قضیہ دوبارہ سر اٹھا رہا ہے

ابھی حال ہی میں سپریم کورٹ نے مسلم خواتین کے سلسلے میں ایک نیا فیصلہ صادر کیا ہے۔ اس فیصلے میں یہ کہا گیا ہے ہے کہ طلاق یافتہ ماؤں کے بچوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بلوغت تک اپنے مصارف کے لئے اپنے باپ سے رقم طلب کریں۔ کورٹ کا کہنا ہے کہ بچوں کو اپنی کفالت کے لئے باپ سے رقم طلب کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ جہاں تک ماں کا تعلق ہے ۱۹۸۶ء میں پاس ہونے والے مسلم خواتین ایکٹ کی رو سے طلاق یافتہ عورت کو اپنے شوہر سے صرف عدت کے دوران نان نفقہ کی طلبی کا حق حاصل ہے۔ کورٹ کا کہنا ہے کہ اگر ملک کے دوسرے بچے 125 CrPc کے تحت اپنے باپ سے کفالت کے لئے رقم طلب کرنے کا حق رکھتے ہیں تو مسلم بچوں کو صرف اس لئے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوگئے ہیں۔ رہا مسلمانوں کے لئے علاحدہ مسلم خواتین ایکٹ ۱۹۸۶ء کا مسئلہ تو کورٹ کا کہنا یہ ہے کہ اس ایکٹ میں مطلقہ خواتین کو اپنے سابق شوہر سے نان نفقہ کی طلبی سے ضرور منع کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں یہ بات نہیں کی گئی ہے کہ ان بچوں کو جو اپنی مطلقہ ماؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں انہیں اپنے باپ سے اخرجات کی طلبی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے سپریم کورٹ نے ابھی تازہ تازہ فیصلے میں یہ حکم جاری کیا ہے کہ بچوں کو ان کے باپوں سے

اخراجات کے لئے باضابطہ رقم دلوائی جائے یہاں تک کہ لڑکا بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے اور لڑکی شادی کے بعد اپنی سسرال کو رخصت ہوجائے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے شاہ بانو قضیہ کو گویا دوبارہ تازہ کر دیا ہے۔ امت کے اہل فکر حضرات کے سامنے ایک بار پھر یہ سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آگیا ہے کہ وہ جس مسلم خواتین بل کے پاس ہو جانے کو آزاد ہندوستان میں شریعت کی فتح سے تعبیر کر رہے تھے۔ اب اسی ایکٹ میں عدالت عالیہ نے ایک نیا نکتہ دریافت کر لیا ہے۔ اسلامی نظام عدل کے حوالے سے دیکھا جائے تو بچے کی تربیت کی ذمہ داری ماں سے کہیں زیادہ باپ پر عائد ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ بچوں کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داری ماں کے سر ڈال دینا کہاں کا انصاف ہے۔ باپ طلاق دے کر اپنی بیوی سے علاحدگی اختیار تو کر سکتا ہے لیکن وہ اپنے بچوں کے مستقبل سے کیسے لاتعلق ہو سکتا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے مسلم خواتین ایکٹ میں باپ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ عورت کو صرف عدت کی مدت تک نان نفقہ ادا کرے۔ البتہ دو سال سے چھوٹے بچوں کے اخراجات کی ادائیگی کی ذمہ

مطلقہ مسلم خواتین کو وقف بورڈ کا راستہ دکھا کر ہم کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔؟ ایک ایسا بے جان قانون پاس کرا کے جس کے نتیجے میں انصاف قائم نہ ہو ہم نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔

جو لوگ اس ملک میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران شریعت کے تحفظ کی تحریک چلاتے رہے ہیں ان کی نظر میں شریعت سے مراد صرف عائلی قوانین، نکاح، وراثت اور طلاق کے مسائل ہیں۔ رہے زندگی کے دوسرے شعبے تو یہ حضرات اسے شریعت سے آزاد سمجھتے ہیں

داری باپ کے سر ڈالی گئی ہے۔ اب سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلے نے نور صبا خاتون بنام محمد قاسم کے مقدمے کے حوالے سے بچوں کے لئے دو سال کی مدت بڑھا کر بلوغت تک کردی ہے۔ گویا اب طلاق دینے والے باپ کے لئے صرف یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا ممکن نہ ہوگا کہ یہ بچے ہماری طلاق یافتہ بیوی سے ہیں۔ جس کو ہم نے دوران عدت کفالت کی رقم دے دی ہے۔ اور ان بچوں کے لئے دو سال کے اخراجات کی رقم بھی چکا دی ہے بلکہ اب باپوں کو اپنی سابق بیویوں کے بچوں کو بھی بلوغت تک پرورش کی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ انصاف کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس فیصلے میں ان تمام ناآسودہ بچوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا سامان ہے جن کے خواب ماں باپ کی خانگی زندگی کے تباہ ہونے سے بکھر جاتے ہیں۔ اور جنہیں صرف اس لئے ایک اذیت ناک زندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ان کی ماں ایک بھرپور ماں نہیں بلکہ ایک مطلقہ ماں ہے۔

البتہ جو لوگ مسلم خواتین بل کو آزاد ہندوستان میں شریعت کی فتح سے گردانتے ہیں یا جو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ مسلم خواتین بل پاس ہوجانے سے اس ملک میں شریعت کو تحفظ حاصل ہوگیا ہے انہیں یقیناً اس فیصلے سے دھچکا لگے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس بل کو بڑے جوش و خروش سے پارلیمنٹ سے پاس کرایا گیا وہ اتنا کمزور اور بے جان سا قانون ہے جس کی مختلف انداز سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جس کا ایک نمونہ اس مذکورہ فیصلے میں سامنے آیا ہے۔ پھر اس ایکٹ میں مسلم خواتین کے لئے عملی انصاف کی گنجائش کم رکھی گئی ہے۔ مطلقہ خواتین سے یہ تو ضرور کہا گیا ہے کہ عدت کے بعد سابق شوہر سے وہ نان نفقہ طلب نہیں کرسکتی اور یہ بات صحیح بھی ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے سابق شوہر مطلقہ عورت کے لئے ایک اجنبی مرد ہوجاتا ہے۔ البتہ موجودہ مسلم معاشرے میں جہاں کسی اسلامی ریاست اور اخلاقی نظام وجود ہیں اور جہاں بے شعور اور خوف خدا سے خالی مسلمان مرد، عورتوں پر ظلم روا رکھے ہوئے ہیں اور جہاں ایک مطلقہ عورت کے لئے دوبارہ اس کی شادی ہونا آسان نہیں اس قانون میں بے بس عورت کے سہارے کی گنجائش بہت کم رکھی گئی ہے۔ اس قانون کے مطابق وقف بورڈ پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ مطلقہ بے سہارا عورتوں کی کفالت کا انتظام کرے۔ جو لوگ اس ملک میں وقف کی موجودہ صورت حال سے واقف ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ عام طور پر وقف بورڈ کو اپنے ملازمین کی تنخواہ کے لئے پیسے نہیں جٹ پاتے پھر بھلا وہ کسی بے سہارا عورت کو کیا سہارا دیں گے۔ وقف کا موجودہ نظام ملک بھر میں انتہائی تباہ حال ہے۔ ان کی آمدنی انتہائی قلیل ہے اور جہاں تھوڑی بہت ہے وہ بھی منتظمین کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ پھر ایک ایسے تباہ حال ادارے کے سر بے سہارا عورتوں کو ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مطلقہ مسلم خواتین کو وقف بورڈ کا راستہ دکھا کر ہم کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔؟ ایک ایسا بے جان قانون پاس کرا کے جس کے نتیجے میں انصاف قائم نہ ہو ہم نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ ہم نے شریعت، اس کے تحفظ اور تحفظ کی ترکیبوں کے سلسلے میں دنیا کے سامنے مضحکہ خیز نمونے پیش کئے ہیں۔

دیکھا جائے تو شریعت (جس سے بالعموم پرسنل لا مراد لیا جاتا ہے) کے تحفظ کا جو نعرہ منقسم ہندوستان کے ابتدائی دنوں میں لگایا گیا تھا آج پچاس سال گذرنے کے بعد بھی ہم وہی نعرہ اتنی ہی بے شعوری کے ساتھ بلند کررہے ہیں۔ اس شعور سے یکسر خالی کہ شریعت ہے کیا اور اس کے نفاذ کا کام اس ملک میں کیسے انجام پاسکتا ہے؟ مسلمانوں نے اس ملک میں سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ شریعت کے تحفظ کی تحریک چلائی اور اس تحریک کو سب سے بڑی کامیابی شاہ بانو کے کیس میں ملی ہے۔ لیکن

اس معرکۃ الآراء کامیابی کا حال یہ ہے کہ اس سے نظام عدل کے قائم ہونے میں کوئی مدد نہیں ملتی ہے۔ یقیناً حاملین تحریک کو کسی حد تک یہ اندازہ تھا کہ اس طرح کی جزوی کاروائی مسلم معاشرے کو دوبارہ اپنی اصل بنیادوں پر قائم نہیں کر سکتی۔ اس لئے اصلاح معاشرہ کے نام سے کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور ملک کے طول و عرض میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے، شرعی عدالتوں کے قیام کی بات بھی سامنے آئی لیکن جلد ہی ایسا محسوس ہوا کہ یہ ساری جدوجہد امت بیمار کا اصل علاج کرنے کے بجائے مریض کے چہرے پر رنگ و روغن ملنے کی مصنوعی کوشش ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام میں نہ تو مسلم معاشرہ پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ ہی مسلم اخلاق و اطوار کو بھرپور نشو و نما حاصل ہو سکتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس ملک میں شریعت کے تحفظ کے لئے بے جان قوانین بنوانے کے بجائے شریعت کے نفاذ کے لئے تیاری کی جاتی کہ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم یہ تاثر تو اس ملک میں یقیناً عام ہو گیا ہوتا کہ اسلام کے پاس ایک مکمل انسانی زندگی کے لئے رہنما اصول موجود ہیں۔ جن کی بنیاد پر ایک عادلانہ معاشرے کا قیام عمل میں آسکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو بے سہارا مسلم خواتین کو زوال زدہ اور قلاش وقف بورڈ کا راستہ دکھانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جو لوگ اس ملک میں گزشتہ پچاس برسوں کے دوران شریعت کے تحفظ کی تحریک چلاتے رہے ہیں ان کی نظر میں شریعت سے مراد صرف عائلی قوانین (نکاح، وراثت اور طلاق) کے مسائل ہیں۔ رہے زندگی کے دوسرے شعبے تو یا تو یہ حضرات اسے شریعت سے آزاد سمجھتے ہیں یا ان کے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ پوری زندگی شریعت کی اتباع میں گزارنے کا کوئی منصوبہ بنائیں۔ خوف کا عالم یہ ہے کہ جب شرعی عدالتوں کے قیام کی بات پر قومی پریس نے واویلا مچایا کہ مسلمان ملک میں متوازی عدالتیں قائم کر رہے ہیں تو حاملین شریعت کی طرف سے انتہائی ملتجیانہ اور مدافعانہ انداز سے یہ کہا گیا کہ چونکہ ملک کی عدالتوں میں بڑے پیمانے پر مقدمات التواء میں پڑے ہیں اس لئے ان عدالتوں میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مقدمات فیصل کرانے سے دراصل حکومت کی عدالتوں پر کام کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کے پاس قضا کا ایک بہتر نظام موجود ہے تو مدافعت کی جنگ لڑنے والوں کو یہ کہنے کا یارانہ تھا۔ پھر شرعی عدالتوں کی کارگزاری نے بھی بہت جلد یہ بات واضح کر دی کہ جن عدالتوں کے پاس قوت نافذہ نہ ہو ان کی حیثیت طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔ یہ نکتہ ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا کہ اسلامی نظام قضا اسلام کے سیاسی نظام کے اندر ہی مؤثر ہو سکتا ہے۔ اور شریعت کی برکات سے اسی وقت ہم پوری طرح فیضیاب ہو سکتے ہیں جب اسے پوری زندگی میں برتنے کا سامان فراہم کیا جائے۔ پچاس سالہ سفر کے بعد تحفظ شریعت کی مہم کا حاصل یہ ہے کہ آئے دن چھوٹے چھوٹے مقدمات میں عدالتوں کی نکتہ آفرینیاں ہماری ساری سابقہ جدوجہد پر پانی پھیر دیتی ہے۔ مسلمانوں کو دستور کے رہنما اصول دفعہ ۴۴ سے مستثنیٰ کر دینے کا معاملہ آج بھی محض ایک مطالبہ ہے 125 CrPc کا ان کے اوپر اطلاق نہ ہونے دینے کا مطالبہ بھی بدستور برقرار ہے۔ تب سے اب تک ملک کا ہر وزیر اعظم یہ وعدے کرتا رہا ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن عدالت کے وقتاً فوقتاً فیصلوں نے مسلمانوں کو پرسنل لاء کے تحفظ کے لئے بڑی بڑی تحریکیں چلانے پر مجبور کیا ہے۔ کہنے کو اس ملک میں شریعت کے تحفظ کے لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ کا موقر ادارہ موجود ہے اور اس ملک میں پچاس سالوں سے پرسنل لاء کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی تحریک بھی چل رہی ہے۔

جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی خواتین میں ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر وہ خواتین ہیں جو مسلم سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنہیں شوہروں نے طلاق کے بعد دھکے دے کر گھروں سے نکال دیا ہے۔

پھر مسلمانوں کی طرف سے عائلی قوانین کا ایک بہتر مسودہ پیش کئے جانے کا وعدہ بھی برقرار ہے۔ لیکن اس ساری چلت پھرت کے باوجود عائلی قوانین میں عدالت کی موشگافیاں جاری ہیں اور پچاس سال گزرنے کے باوجود مسلمان پرسنل لاء کا ایک بہتر مسودہ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

یہ ہے تحفظ شریعت کے محاذ پر ہماری پیش رفت کا حال۔ یعنی، ۱۹۴۷ء میں ہم جہاں تھے وہیں آج بھی کھڑے ہیں البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ شریعت کے نام سے آج عام مسلم ذہنوں میں جو تصور ابھرتا ہے وہ صرف مسلم پرسنل لاء کا۔ مسلمانوں کا سواد اعظم یہ سمجھنے لگا ہے کہ شریعت صرف پرسنل لاء تک محدود ہے بقیہ زندگی میں وہ جو چاہیں کریں۔

صورت حال انتہائی سنگین ہے۔ بے انصافی کی ماری بے شمار مسلم خواتین وقف بورڈ کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے طوائف خانوں کی طرف رخ کر رہی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے ایک سروے کے مطابق بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، اور آندھرا پردیش میں جسم فروشی کا دھندہ کرنے والی خواتین میں ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر وہ خواتین ہیں جو مسلم سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنہیں شوہروں نے طلاق کے بعد دھکے دے کر گھروں سے نکال دیا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے اس پیشے میں انہیں امید نظر آئی ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں کوزی کوڈے سے ایک خبر آئی ہے کہ وہاں مطلقہ مسلم خواتین نے "نساء" کے نام سے ایک انجمن بنائی ہے، ان خواتین کا کہنا ہے کہ دین اور شریعت کے حوالے سے مسلم خواتین پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ چونکہ ملک میں کوئی اسلامی نظام قضا یا اسلامی ریاست نہیں ہے اس لئے طلاق کا دھڑلے سے استعمال کرنے والے مردوں کے خلاف وہ اپنا مقدمہ داخل نہیں کر سکتیں۔

"نساء" جیسی بے شمار انجمنیں اہل فکر مسلمانوں کو دعوت دے رہی ہیں کہ اس ملک میں تحفظ شریعت کی مہم سے کنارہ کش ہو کر نفاذ شریعت کی مہم کا حوصلہ پیدا کریں، کہ شریعت کا تحفظ یوں بھی ایک غیر اسلامی خیال ہے۔ اللہ کی شریعت تحفظ کے لئے نہیں بلکہ نفاذ کے لئے اتاری گئی ہے۔ مستقبل اسی رویے کے ساتھ وابستہ ہے۔

بقیہ: آپ کی الجھنیں

اپنے صاحب رائے ہونے کے زعم میں اس کی توہین کرے یہ بات اسوہ رسول کے خلاف ہے۔ غرضیکہ نازک اور حساس معاملے میں آخری فیصلہ مرد اپنے ہاتھ میں رکھے اور اس کا خوف نہ رکھے کہ بیوی اس سے الگ ہو جائے گی یا اس کے ساتھ بدمعاملگی کرے گی۔ یہی تو وہ بات ہے جس سے بیویاں سمجھ لیتی ہیں کہ مرد کو تو ان کے مطالبات پورے کرنے ہیں اور یہی اصول فطرت ہے کہ شوہر ہی بیوی کو خوش کرنے کی ہر وقت کوشش کرے۔ لہذا وہ زیادہ سے زیادہ فرمائشیں کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لیتی ہیں۔ اس طرح کہ مرد ہمیشہ دیتا رہتا ہے اور وہ صرف لیتی رہتی ہیں۔ یہاں مقصود نہیں کہ عورت پر مرد کی حکمرانی ہو کیونکہ یہ بات تو انسانی نقطہ نظر سے بھی درست نہیں چہ جائیکہ ایک مسلمان شوہر اپنی بیوی کو محکوم بنا کر رکھے۔ مقصد یہ ہے کہ زوجین اپنے فرائض کی انجام دہی کی طرف توجہ دیں۔ ایک دوسرے سے کسی کو ضرر اور ایذا نہ پہنچے۔

مراسلہ نگار اور شادی کا نیا تجربہ اٹھانے والے تمام افراد کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ بیوی کی خوشنودی یا اس کی علیحدگی کے خوف سے تمام تر ازدواجی معاملات آنکھ بند کر کے اس کے حوالے یہ کہہ کے نہ کر دیں کہ "سپردم بہ تو مایہ خویش را، تو دانی حساب کم و بیش را" یہ رویہ زوجین میں سے دونوں کے لئے خطرناک ہے کیونکہ بیوی کے ذہن میں ازدواجی تعاون کا غلط تصور قائم ہوتا ہے۔ اس سے توازن بگڑتا ہے اور عورت یہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور ناانصافی برتی جا رہی ہے۔ جب کہ یہ احساس درست نہیں ہے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں عورت اپنی بات منوانے کے لئے رونے دھونے کا سہارا لیتی ہے اور میاں سے ہفتوں جھگڑا ٹھنا رہتا ہے۔ آخر اس حربے سے مرد عورت کے آگے کمزور پڑ جاتا ہے۔ وہ رعایت پر رعایت کرتا جاتا ہے، عورت اس کی عادی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن یہ رعایتیں صرف ایک ہی طرف سے ہوتی ہیں یعنی مرد کی طرف جب کہ دوسری ہتھیلی خالی ہی رہتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے اس میں دونوں کی شرکت ہو۔ یہ اچھی بات ہے کہ مرد عورت کے دکھ سکھ میں شریک ہو اس کی تیمارداری کرے۔ اس میں اچھی بات یہ ہے کہ بوقت ضرورت عورت مرد کی دلجوئی اور تیمارداری کرے لیکن ازدواجی زندگی میں عدم توازن کی بنا پر آج ہو یہ رہا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کو کچھ دینے اور ایک دوسرے سے کچھ پانے کے بجائے ایک کا کام صرف دینا سمجھ لیا گیا ہے تو دوسرے کا کام صرف لینا تصور کر لیا گیا ہے۔ آپ نے جو بیوی کے ساتھ حد درجہ نرمی کا برتاؤ رکھا ہے اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ معاملات میں ڈھیل اسی وقت تک دی جانی درست ہے جہاں تک اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمان

کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

ہندوستان جہاں مسلمان کوئی ہزار سال تک ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں، دلی اور آگرہ کی عمارتیں زبان حال سے کہتی ہیں کہ یہ سب کچھ بہت زیادہ پرانا واقعہ نہیں ہے۔ اسی ہندوستان میں اب صورت حال یہ ہے کہ نئے نظام کے اندر اعلیٰ عہدوں پر ڈھونڈنے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا۔ گزشتہ پچاس برسوں میں سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کی تعداد مسلسل روبہ زوال رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "آزادی" کے بعد حکومت ہند نے بعض ایسے خصوصی خفیہ سرکلر جاری کئے جس کے نتیجے میں اہم حساس عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر روک دیا گیا یہ سرکلر چونکہ خفیہ نوعیت کے تھے اس لئے اس پر عوامی حلقوں میں کوئی کھلی بحث نہ ہو سکی۔ البتہ وہ مسلمان جو ان ہدایات کی زد میں براہ راست آگئے تھے انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی اس محرومی کا تذکرہ کیا ہے۔ کوئی دو سال پہلے مغربی بنگال کے ایک آئی اے ایس افیسر ایس ایم مرشد نے ٹائمز آف انڈیا کی بعض اشاعتوں میں اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ کس طرح حکومت کی مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں ان کی نسل کے بہت سے سرکاری ملازموں کو مطلوبہ ترقیوں سے محروم ہونا پڑا۔ کچھ اسی قسم کے احساسات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر سید ہاشم علی نے اپنے قیام علی گڑھ کے دوران کیا تھا۔ سید ہاشم کا کہنا تھا کہ پٹیل نے اپنے دور وزارت میں مسلمانوں کو حساس عہدوں پر مقرر نہ کئے جانے کا جو خفیہ حکم جاری کیا تھا وہ خود اس کی زد میں آگئے تھے۔ البتہ چونکہ اس طرح کی پالیسی امور سے متعلق فیصلے حکومت کی خفیہ دستاویزات کا حصہ بنے رہے اس لئے اس بارے میں عوامی حلقوں کو کوئی تفصیلی معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ البتہ گاہے بہ گاہے اس طرح کی باتوں کے منظر عام پر آنے سے اس خیال کو تقویت ملی کہ نہ جانے اس طرح کے کتنے فیصلے حکومت کی خفیہ فائلوں میں محفوظ ہوں۔ جن کے اثرات کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک وزارت دفاع میں کسی اہم عہدے پر تو درکنار معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کو داخلہ نہیں مل سکا ہے مسلمانوں کے تئیں حکومت ہند کے جانبدارانہ رویے کے لئے صرف یہی ایک مثال کافی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں سے ساؤتھ بلاک کی عمارت مسلمانوں کے وجود سے خالی ہے۔؟

سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو محروم کرنے کا رجحان تب ہی شروع ہو چکا تھا جب ملک کے مختلف حصوں میں آزادی سے کچھ پہلے کانگریسی حکومتیں وجود میں آ گئی تھیں۔ تب سے اب تک اس رجحان نے ایک کلیے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور اب پچاس سالوں کے بعد اس مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں جو چیز سامنے آرہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے متعلق ڈائرکٹری کے صفحات الٹ جائے مگر کوئی مسلم نام ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ ۱۹۳۹ء میں جب کانگریسی حکومتوں کی مسلم دشمن پالیسیوں پر مسلم لیگ نے شور مچایا تھا تب بھی مسلمان آج کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھے۔ ۱۹۳۹ء میں یوپی میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۴ فیصد تھا جو کم و بیش آج بھی وہی ہے تب پنڈت گووند ولبھ پنت جو اس وقت یوپی کے وزیر اعظم تھے

> کوئی دو سال پہلے مغربی بنگال کے ایک آئی اے ایس افیسر ایس ایم مرشد نے ٹائمز آف انڈیا کی بعض اشاعتوں میں اس راز سے پردہ اٹھایا تھا کہ کس طرح حکومت کی مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں ان کی نسل کے بہت سے سرکاری ملازموں کو مطلوبہ ترقیوں سے محروم ہونا پڑا۔

نے سرکاری ملازمتوں سے متعلق اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعداد کچھ اس طرح بتائی تھی۔

آزادی سے قبل سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب

مناصب	ہندو	مسلمان
صوبائی ایگزیکٹیو ملازمت	52.5	39.6
تحصیلدار	54.9	43.6
نائب تحصیلدار	55.9	41.4
صوبائی جوڈیشیل ملازمت	72.0	25.0
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس	56.0	28.0
پولیس انسپکٹر	54.2	43.8
ہیڈ کانسٹیبل	35.3	64.4
یوپی ایگریکلچرل سروس کلاس ون	64.0	21.0
ایگریکلچرل سروس کلاس ٹو	76.0	12.0
سب آرڈینیٹ ایگریکلچرل سروس	73.0	25.0
ویٹرینری انسپکٹر	24.0	52.0
ویٹرینری اسسٹنٹ سرجنس	35.0	58.0
گزیٹڈ آفیسر کو آپریٹو ڈپارٹمنٹ	62.5	37.5
یوپی فارسٹ سروس	57.0	19.0
فارسٹ رینجرس	80.5	18.5
ڈپٹی رینجرس	74.4	25.0
اسسٹنٹ ایکسائز کمشنر	57.0	14.0
ایکسائز انسپکٹر	55.0	31.0
یوپی ایجوکیشن سروس کلاس ون آفیسر	15.0	4.0

نمونے کے لئے ہم نے دو عہد کی ایک اجمالی تصویر آپ کے سامنے پیش کی ہے تاکہ آپ خود اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔

چونکہ اس مسئلے پر باقاعدہ اعداد و شمار حکومت فراہم نہیں کرتی اور نہ ہی مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ اتنے بڑے ملک میں چھوٹے سے بڑے ہر عہدے پر اپنی نمائندگی کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ اس لئے صورت

اب اس صورت حال کا مقابلہ ۱۹۸۱ء میں سرکاری ملازمتوں میں مسلم نمائندگی سے کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمان

(۱۹۸۱)

ملازمت		مجموعی تعداد	مسلمان	مسلم تناسب
آئی اے ایس	۱۹۸۱ میں	3,883	,116	2.99
آئی پی ایس	۱۹۸۱ میں	1,753	,50	2.85
انکم ٹیکس	۸۱-۱۹۷۱ کے	,881	,27	3.06
ریلوے ٹریفک اور اکاونٹ	دوران	,415	,11	2.65
بینک		1,13,77275,,951	2, 479	2.18
مرکزی حکومتوں کے دفاتر میں		8,26,669	3, 346.	4.41
صوبائی حکومتوں کے دفاتر میں			49, 718	6.01

حال کا کسی قدر صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ مختلف مواقع پر حاصل Sample سروے سے کام چلائیں۔ اسوقت ہمارے سامنے تعلقدار کمیشن ۱۹۷۱ء کی رپورٹ کھلی ہے جس میں مغربی بنگال کیڈر کے ۲۶۴ آئی اے ایس افسران میں صرف دو مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ گوپال سنگھ رپورٹ کے مطابق مسلم آبادی والی تین اہم ریاستوں آسام، بہار اور مغربی بنگال میں ایک بھی کلاس ون آفیسر مسلمان نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ۲۲۳۲ کلاس ون آفیسروں میں صرف ۳۶ مسلمان ہیں جن میں ۲۲ کا تعلق کیرالہ سے ہے۔ کچھ اسی طرح کی انتہائی مایوس کن صورت حال دوسری چھوٹی بڑی ملازمتوں کی بھی ہے۔ سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہم جس رپورٹ کے صفحات بھی پلٹتے ہیں ہماری مایوسی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سرکاری بینکوں سے متعلق ایک رپورٹ ہمارے سامنے ہے جس میں ہم نے مسلمانوں کے نام تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح لائف انشورنس کارپوریشن کی ایک سالانہ رپورٹ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۶۵ اسامیوں پر بڑی مشکل سے صرف چار مسلم ناموں کا سراغ لگ پایا ہے، سخت مایوس ہو کر اب ہم نے مرکزی حکومت کے کلیدی دفاتر کا رخ کیا ہے اس امید میں کہ شاید مرکز سے قربت اور سیکولر سیاستدانوں کی براہ راست نگہداشت کی وجہ سے دلی کے اہم سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کا وجود محسوس ہو لیکن یہاں بھی ناظر کے حصے میں مایوسی کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا وزیر اعظم کا دفتر ہو یا دوسرے اہم اداروں کے دفاتر یہاں بھی

سکریٹری، ایڈیشنل سکریٹری حتی کے جوائنٹ سکریٹری کی سطح پر بھی مسلمانوں کا سراغ نہیں ملتا۔ کہیں کہیں جا بہ جا اگر ایک آدھ نام نظر بھی آتا ہے تو اس لمبی چوڑی فہرست میں اس کی حیثیت علامتی بھی نہیں کہی جاسکتی۔

۱۹۸۰ء میں حکومت ہند نے ایک اعلی اختیاراتی پینل تشکیل دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اقلیات کے سلسلے میں یہ معلومات فراہم کرے کہ سرکاری ملازمتوں میں انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے۔ اس پینل نے صورت حال کا پتہ لگانے کے لئے Sample سروے کا طریقہ اختیار کیا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں پارلیمنٹ میں پینل کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔ جس میں اقلیات کے سلسلے میں مختلف تجاویز اور مشورے تھے۔ اس رپورٹ میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اقلیات کی خصوصی کوچنگ کا انتظام کرنے کا مشورہ بھی تھا۔ گزشتہ دنوں جب حکومت نے مسلمانوں کو تعلیمی طور پر ایک پسماندہ قوم قرار دیا تب یہ تاثر بھی عام ہوتا گیا کہ اگر مسلمان ملازمتوں میں اپنے تناسب سے بہت پیچھے ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں تعلیم یافتہ لوگوں کا فقدان ہے۔ پھر حکومت کی وقتاً فوقتاً جاری ہونے والی کاغذی اسکیموں سے بھی اس تاثر کو تقویت پہنچی کہ حکومت تو اس سلسلے میں مخلص ہے کہ مسلمانوں کو ملازمتوں میں جائز حصہ دیا جائے البتہ خود مسلمان اس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اس تاثر سے تحریک پاکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے مسلمان نوجوانوں کو آئی اے ایس کے امتحانات میں بیٹھنے کی ترغیب دی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر منصوبہ بند طریقے سے مسلم نوجوانوں کو ان مقابلہ جاتی امتحانات میں بیٹھنے کی ترغیب دی جائے گی تو جلد ہی اس کے بہتر نتائج سامنے آجائیں گے۔ موصوف نے یونیورسٹی کے وسائل اور اپنی ذاتی لیاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی، طلباء کو سہولتیں فراہم کی گئیں، رہنمائی کے انتظامات کے گئے لیکن دس بارہ سال کی زبردست جدو جہد کے باوجود آئی اے ایس میں مسلم نوجوانوں کا تناسب وہی مقررہ دو ڈھائی فیصد رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اب ان نوجوانوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو حامد صاحب کی کوچنگ اور رہنمائی سے مستفید ہو رہے تھے۔ رہی مسلمانوں کے تناسب گھٹنے یا بڑھنے کی بات تو اس میں کوئی واضح فرق واقع نہ ہو سکا۔ اس تجربے سے کچھ اور ثابت ہوا ہو یا نہیں۔ اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ان سرکاری عہدوں پر تقرر کا فیصلہ مقابلہ جاتی امتحانات نہیں بلکہ پالیسی ساز کرتے ہیں۔ اب اگر حکومت کے پالیسی ساز مسلمانوں کے تناسب کو ایک خاص سطح تک برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو کوئی تعلیمی تحریک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سیاسی سازشوں کا توڑ تو سیاسی عمل کے ذریعہ ہی کیا جاسکتا ہے۔

وزیر اعظم کا دفتر ہو یا دوسرے اہم اداروں کے دفاتر یہاں بھی سکریٹری، ایڈیشنل سکریٹری حتی کے جوائنٹ سکریٹری کی سطح پر بھی مسلمانوں کا سراغ نہیں ملتا۔ کہیں کہیں جا بہ جا اگر ایک آدھ نام نظر بھی آتا ہے تو اس لمبی چوڑی فہرست میں اس کی حیثیت علامتی نہیں کہی جاسکتی۔

پچاس سالوں کے بعد اس مسلم دشمن پالیسی کے نتیجے میں جو چیز سامنے آرہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ حکومت کے اعلی عہدیداروں سے متعلق ڈائرکٹری کے صفحات کے صفحات الٹ جائیے مگر کوئی مسلم نام ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ ۱۹۳۹ء میں جب کانگریسی حکومتوں کی مسلم دشمن پالیسیوں پر مسلم لیگ نے شور مچایا تھا تب بھی مسلمان آج کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھے۔

اس شمارے کی قیمت پندرہ روپے
سالانہ چندہ ساٹھ روپے / بیس امریکی ڈالر
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹر نیشنل ۱۰-۱۳۹، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا
فون نمبر: ۶۸۲۷۰۱۸ - ۶۹۲۶۰۳۰

نظام جبر نے مسلمانوں کی ایک مجہول نسل کو جنم دیا ہے

سیکولر۔ پروگریسو اور معتدل مسلمانوں کی کہانی

ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی ایک ٹھہرا ٹھہرا دھیما دھیما نامحسوس عمل ہے۔ یہاں بوسنیا جیسی شدت نہیں جس پر پوری دنیا چیخ اٹھے اور ہر خاص و عام مسلمان کو یہ محسوس ہونے لگے کہ اس کی ملی زندگی اب محفوظ نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہاں مسلمانوں سے ان کا نظریاتی سرمایہ، انبیائی حوصلہ اور آخری رسول کی امت ہونے کا احساس رفتہ رفتہ سلب کیا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں سے اس عمل کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اندر مختلف مجہول نسلوں کی نشو و نما دیکھی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ابتدائی دنوں میں ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جو خواہ مخواہ پاکستان بنانے کے احساس جرم میں مبتلا تھی۔ زندگی جینے کے لئے ان حضرات کو فدویانہ اور خوشامدانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔ پھر ان کے درمیان پرورش پانے والی نسبتاً نئی قیادت نے سیکولر آرڈر کے قیام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ علماء ہوں یا دانشور اب یہ تمام حضرات حکومت وقت سے التجا و فریاد میں سیکولرزم اور جمہوریت کے تقدس کی دہائی دیتے تھے۔ رہے وہ لوگ جو براہ راست حکومت کی مشنری سے فیضیاب ہو رہے تھے تو ان بے چاروں کو بار بار دستور، جمہوریت اور ملک کے تئیں اپنی وفاداری کا اعادہ کرنا ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے فدویانہ رویے کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جب ڈاکٹر ذاکر حسین کانگریس کی طرف سے صدر جمہوریہ کے امیدوار تھے اور اس موقع پر جن سنگھی پریس نے انہیں رجعت پسند ثابت کرنے کے لئے مسلم پرسنل لاء کا حامی بتایا تو ذاکر صاحب کو انتہائی مدافعانہ انداز میں اپنی صفائی دیتے ہوئے کہنا پڑا کہ "میں نے حکومت ہند سے صرف یہ کہا تھا کہ پرسنل لاء میں مداخلت سے ہندوستان کے دشمنوں کو موقع مل جائیگا کہ وہ مسلم ممالک میں ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ پہلے خود مسلمانوں کے اندر سے یہ مطالبہ اٹھنا چاہئے کہ پرسنل لاء میں تبدیلی ہو" (بحوالہ الفرقان مئی ۱۹۷۰)
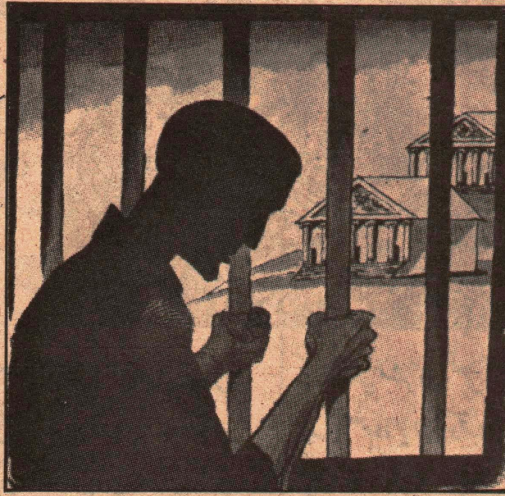
اسی طرح مولانا اسعد مدنی نے مسلم مجلس مشاورت سے صرف اس لئے علاحدگی اختیار کر لی کہ مجلس نے ہندو پاک جنگ کے نازک موقع پر اپنا کوئی اجلاس طلب نہیں کیا۔ مولانا اسعد مدنی نے مشاورت کے بانی صدر سید محمود کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ "ہندو پاک جنگ کے دوران آپ نے ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں، مگر مجھے تعجب ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی" (بحوالہ الجمعیۃ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۰ء) کچھ اسی قسم کی صورت حال اس وقت پیش آئی جب انہدام کے نتیجے میں ممبئی میں ہونے والے دھماکوں کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کے تین اہم اراکین کے دستخط سے روز نامہ انقلاب میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں یہ بتایا گیا کہ مسلمان اس ملک کے دستور میں پورا یقین رکھتے ہیں اور ان تینوں حضرات نے گویا ملک کے ساتھ اپنی وفاداری کی تجدید کا عہد کیا تھا۔

اس نظام کے اندر مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جو شخص بھی کسی اہم عہدے پر نظر آتا ہے سمجھ لیجئے کہ اس نے اس کی اتنی ہی بڑی قیمت ادا کی ہے، جو بات سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ اس نظام نے مسلمانوں

اس نظام کے اندر مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جو شخص بھی کسی اہم عہدے پر نظر آتا ہے سمجھ لیجئے کہ اس نے اس کی اتنی ہی بڑی قیمت ادا کی ہے، جو بات سب سے زیادہ وہ تشویشناک ہے وہ یہ کہ اس نظام نے مسلمانوں کی ایک ایسی مجہول نسل کو جنم دیا ہے جو اپنے اسلامی ورثے پر شرمندہ ہے۔

کی ایک ایسی مجہول نسل کو جنم دیا ہے۔ جو اپنے اسلامی ورثے پر شرمندہ ہے۔ چنانچہ آئے دن اس قسم کے بیانات آتے رہتے ہیں جس میں ایک مسلمان امت کی شناخت پر دوسری مجہول شناخت کو مقدم گردانتا ہے۔ چنانچہ سیاست ہو یا سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر نظر آنے والے اکا دکا مسلمان، وزراء ہوں یا گورنر ان کے فعل کو تو چھوڑیئے کہ دلوں کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ البتہ ان کے قول ہی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ ان مسلم نما لوگوں کی نسل اپنا تعلق آخری رسول کی امت سے بتانے میں شرم محسوس کرتی ہے۔ عبدالکریم چھاگلہ نے تو صاف طور پر قریہ اعلان کیا تھا کہ "میری رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے اور معروف آرٹسٹ ایم ایف حسین برملا اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ " میں ہمیشہ سے اسلام کے مقابلے میں ہندو ازم سے زیادہ قریب رہا ہوں " (بحوالہ السٹریٹڈ ویکلی ۲۰ دسمبر ۱۹۸۳ء) یہاں تک کہ جن لوگوں کو ملی سیاست کے حوالے سے مسلمانوں میں کسی زمانے میں اعتبار حاصل رہا ہے ان بے چاروں کا بھی حال یہ ہے کہ انہیں اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسے بیانات دینے پڑے ہیں جس سے ان کی اسلامی شناخت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ بابری مسجد کو آرڈینیشن کمیٹی (مرحوم) کے صدر سید شہاب الدین کو جب قومی اخبارات نے جناح ثانی لکھنا شروع کیا تو انہوں نے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جناح ثانی بننے کے بجائے نہرو ثانی بننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر کسی مسلم قائد کے لئے نہرو آئیڈیل کی حیثیت سے سامنے آتا ہے تو یہ ایک انتہائی تشویشناک بات ہے۔ انصاف پارٹی کے تجربے کی ناکامی کے بعد جب بڑی سیاسی پارٹیوں نے سید شہاب الدین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اپنے سیکولر کردار کو نکھارنے کے لئے سید صاحب کو اسلامی انتہا پسندوں کے خلاف کئی مضامین لکھنے پڑے۔

نظام جبر کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ آپ اپنی صحیح مسلم شناخت کے ساتھ اس نظام کے اندر اپنی جگہ نہیں بنا سکتے۔ حتیٰ کہ ملی قائدین بھی جب جب مختلف وزراء اعظم کے پاس مسلمانوں کا مقدمہ لے کر گئے ان کی گفتگو میں فدویانہ، ملتجیانہ اور خوشامدانہ لب و لہجہ غالب رہا۔ مسلمانوں کی ملی زندگی ہو یا سیاسی سرگرمی، مناصب کے حصول کی کوشش ہو یا مراعات طلبی کی التجاء، یہ سب کے سب حاکم وقت کی مکمل نگاہ التفات کے محتاج رہے، مسلمانوں کے اندرون میں ان کی اصل ملی اسلامی شخصیت نے دم توڑ دیا۔ لہٰذا وہ دل دوز مناظر دیکھنے میں آئے کہ ایک مسلم گورنر مورتی کے آگے آداب بجا لانے میں مصروف ہے، اخبارات میں یہ تصویر چھپی، گورنر موصوف کو اس پر شرمندگی کیا ہوتی عام مسلمانوں میں بھی کوئی اضطراب پیدا نہ ہو سکا۔ کچھ اسی قسم کا سنگین جرم سابق ریلوے وزیر نے بر سر عام انجام دیا۔ ان کے ہندو مندر میں جانے اور وہاں گل پوشی کرنے کی خبر بھی اخبارات کی زینت بنی، لیکن ان کا اسلام جوں کا توں برقرار رہا۔ ابھی حال ہی میں موجودہ وزیر داخلہ جب حج کے بعد دلی کے اندرا گاندھی ہوئی اڈے پر اترے تو ان کی باقاعدہ آرتی اتاری گئی اخبارات میں یہ تصویر بھی شائع ہوئی لیکن علماء کی طرف سے اس قسم کے اعلانیہ مشرکانہ فعل کی کوئی مذمت نہ ہوئی۔ حد تو یہ کہ تامل ناڈو میں ایک مسلم وزیر اس وقت کی وزیر اعلیٰ جے للتا کو باقاعدہ سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل کے اس منظر کو بھی مسلمانوں نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا۔ اس قسم کے واقعات نے عام مسلمانوں

ابھی حال ہی میں موجودہ وزیر داخلہ جب حج کے بعد دلی کے اندرا گاندھی ہوئی اڈے پر اترے تو ان کی باقاعدہ آرتی اتاری گئی اخبارات میں یہ تصویر بھی شائع ہوئی لیکن علماء کی طرف سے اس قسم کے اعلانیہ مشرکانہ فعل کی کوئی مذمت نہ ہوئی۔

میں دین کی وقعت ختم کر دی ہے۔ دین کے تئیں ہم اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ معمولی معمولی مراعات کے لئے اعلانیہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرنا ہمارے معمول کا حصہ بن گیا ہے۔ جب کسی امت سے باحوصلہ لوگوں کی نسل ختم ہو جائے۔ سخت حالات میں اعلائے کلمۃ اللہ کی صدا بلند کرنے والی زبان خاموش ہو جائے اور اس میں معمولی فائدوں کے لئے دین و ایمان بیچ

دینا مقبول عام رویہ قرار پائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ نظری طور پر وہ امت زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔

۱۹۸۶ء میں جب ملک کے طول و عرض میں ہندوستانی مسلمان شریعت کے حوالے سے اپنی ملی زندگی کی سب سے بڑی تحریک چلا رہے تھے اور جب پوری امت اس بات پر متفق تھی کہ پرسنل لاء کی تفہیم و تشریح کا حق کسی غیر اسلامی عدالت کو نہیں دیا جاسکتا۔ اور اس وقت شاہ بانو قضیئے نے حکومت اور مسلمانوں کے مابین ایک فیصلہ کن معرکہ برپا کر رکھا تھا۔ عین اسی لمحے مجہول مسلمانوں کی پروگریسو نسل نے حکومت کے نام یہ اپیل جاری کی کہ 125CrPc سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہ کیا جائے۔ یعنی جس وقت پوری امت ایک مسئلے پر مجتمع تھی عین اسی نازک لمحے پروگریسو مسلمانوں نے امت کے خلاف ایک منشور جاری کر دیا۔ اس فہرست میں وہ سارے نام شامل ہیں جو اس نظام سے فوائد کشید کرنے میں آگے آگے رہے، آپ کی دلچسپی کی خاطر اور ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ہم وہ فہرست جوں کی توں شائع کئے دے رہے ہیں۔ تاکہ امت کے اصحاب فکر نظام جبر کی پیدا کردہ اس مجہول نسل کے سلسلے میں بھی کوئی موقف اختیار کر سکیں۔

ملاحظہ کیجئے مجہول مسلمانوں کی یہ فہرست

پروگریسو مسلمانوں کی اپیل

ہم دستخط کنندگان

مطالبہ کرتے ہیں (۱) کہ 125CrPc دفعہ میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے

(۲) کہ مطلقہ مسلم خواتین کا یہ حق کہ وہ اپنے سابق شوہروں سے نان و نفقہ وصول کر سکیں برقرار رکھا جائے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ

(۱) مطلقہ عورتوں کے سلسلے میں مرد کو نان و نفقہ کی ذمہ داری سے بری کر دینا دراصل CrPc کی دفعہ 125 کی روح سے متصادم ہے جس کا مقصد بے سہارا عورتوں کو تحفظ دینا ہے

(۲) حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ عورتوں کو دستور میں دیئے گئے حقوق محفوظ رہیں۔

(۱) خواجہ احمد عباس: فلم ساز اور رائٹر
(۲) شبانہ اعظمی: فلمی اداکارہ
(۳) جاوید اختر فلم رائٹر
(۴) علی سردار جعفری شاعر
(۵) سعید مرزا فلم ساز
(۶) ای۔ القاضی اسٹیج ڈائرکٹر
(۷) شہریار شاعر
(۸) سلیم پیرادینا شاعر
(۹) مظفر علی فلم ساز
(۱۰) فیصل القاضی تھیٹر ڈائرکٹر
(۱۱) امل الانہ تھیٹر ڈائرکٹر
(۱۲) شوکت کیفی فلم اداکارہ
(۱۳) وی۔ ایم۔ عدیل فلم رائٹر
(۱۴) سلیم علی ارینتھولوجسٹ، ایم پی
(۱۵) مونس رضا وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی
(۱۶) عذرا قدوئی لکچرر دہلی یونیورسٹی
(۱۷) سکینہ حسن ریٹائرڈ ریڈر دہلی یونیورسٹی
(۱۸) سید زیدی ریڈر دہلی یونیورسٹی
(۱۹) صہبا حسین آئی پی کالج، دہلی یونیورسٹی
(۲۰) معصوم علی لکچرر دہلی یونیورسٹی
(۲۱) عابد حسین ممبر پلاننگ کمیشن
(۲۲) عبید صدیقی سائنس داں
(۲۳) ظہور قاسم سائنسداں
(۲۴) اے۔ رحمان سائنٹسٹ
(۲۵) بشیر الدین احمد سوشل سائنٹسٹ
(۲۶) علی باقر سوشل سائنٹسٹ
(۲۷) رئیس احمد ماہر تعلیم
(۲۸) رشید الدین خان پروفیسر جے این یو
(۲۹) نجمہ ظہیر باقر پروفیسر جے این یو
(۳۰) ضویا حسن ریڈر جے این یو
(۳۱) عمرانہ قدیر ریڈر جے این یو
(۳۲) اعجاز الدین احمد پروفیسر جے این یو
(۳۳) عطیہ حبیب ریڈر جے این یو
(۳۴) ایم ایس آگوانی پروفیسر جے این یو
(۳۵) عرفان حبیب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۳۶) مقبول احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۳۷) زاہدہ زیدی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳۸) ساجدہ زیدی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۳۹) اقتدار عالم خان پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۰) اسلم قدیر پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۱) عابدہ سمیع الدین ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۲) شاد بانو احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۳) عمر حسن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۴) سائرہ حبیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۵) کشور شبیر خان پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۶) میمونہ جعفری ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۷) فوزیہ مجیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۸) کیو۔ ایم۔ عثمانی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۴۹) فرحان مجیب ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۰) محمود الحق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۱) عارف رضوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۲) بلقیس موسوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۳) شیریں موسوی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۴) ایس حسین پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۵) مظفر عالم ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۵۶) ایم اے حلیم سابق اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی
(۵۷) بدر الدین طیب جی آئی سی ایس ریٹائرڈ
(۵۸) اصغر علی انجینئر مصنف
(۵۹) شفیق نقوی مصنف
(۶۰) نسیم حسن سوشل سائنٹسٹ
(۶۱) علی اشرف مصنف
(۶۲) سیدہ سیدین مصنف
(۶۳) رشید طالب جرنلسٹ
(۶۴) سعید نقوی جرنلسٹ
(۶۵) سیما مصطفیٰ
(۶۶) انور عظیم مصنف
(۶۷) انیس جنگ جرنلسٹ
(۶۸) حسن سرور جرنلسٹ
(۶۹) ضیاء الحسن جرنلسٹ
(۷۰) دانیال لطفی ایڈوکیٹ
(۷۱) کاملہ طیب جی ایڈووکیٹ
(۷۲) غلام شیخ پینٹر
(۷۳) اے جے قدوئی ریٹائرڈ آئی اے ایس
(۷۴) سلمان حیدر آئی ایف ایس
(۷۵) محب الحسن پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۶) مشیر الحسن پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۷) صغریٰ مہدی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۸) حبیب الرحمان قدوئی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۷۹) آر اے خان لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ
(۸۰) شمشاد حسین پینٹر
(۸۱) روشن القاضی ڈائرکٹر آرٹ گیلری
(۸۲) معین شاکر پروفیسر مراٹھواڑہ یونیورسٹی
(۸۳) جعفر ظہیر ریڈر ہماچل یونیورسٹی
(۸۴) جاوید عالم ریڈر ہماچل یونیورسٹی
(۸۵) سلیم طیب جی اڈیٹر کیو یو پی
(۸۶) حسن کٹی دستاویزی فلم ساز
(۸۷) مزمل حسین آرٹسٹ
(۸۸) فاطمہ الطالب ڈائرکٹر ایڈور ٹائزنگ ایجنسی
(۸۹) سمیر آغا پرسنل اکزیکیوٹو
(۹۰) ذکیہ ظہیر سماجی کارکن
(۹۱) سعدیہ دہلوی ایڈیٹر شمع
(۹۲) طاہرہ حسن اے آئی آر براڈ کاسٹر
(۹۳) ہندل طیب جی آئی اے ایس
(۹۴) صبا زیدی ٹی وی پروڈیوسر
(۹۵) شہلا حیدر گورنمنٹ آفیشیل
(۹۶) عسکری امام بزنس اکزیکیوٹو
(۹۷) ایس اے قیوم ڈائرکٹر عرب کلچرل سینٹر
(۹۸) تسنیم عثمانی لائبریرین امریکن سینٹر
(۹۹) رفعت ظہیر سماجی کارکن
(۱۰۰) اسماء منظر سول سرونٹ

اس کے علاوہ ۱۷ مزید ترقی پسند اور دانشور افراد کے اسمائے گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔

(بحوالہ مسلم انڈیا مارچ ۱۹۸۶ء ص ۱۳۵)

احتساب

تحریر: سید حامد

سابق وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان نے ترقی کی ہوش ربا منزلیں طے کیں۔ لیکن بد قسمتی سے مادی ترقی کے ہم رکاب اخلاقی تنزلی بھی آئی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے وہ مادی ترقی میں اپنے اہل وطن کا ساتھ نہ دے سکے۔ لیکن اخلاقی تنزلی میں ان سے آگے نکل گئے۔ یہ بات اتنی ہی دردناک ہے جتنی حیرت انگیز کہ وہ امت جس کا دستور حیات اتنا واضح ہے، جو اتحاد، ایثار، حصول علم، خدمت اور حرکت اور ریاضت کے لئے مکلف ہے، اور جس کے لئے جوابدہی سے کوئی مفر ہے ہی نہیں۔ وہ جہالت، خود غرضی، نفسانیت، کاہلی، کم کوشی، تن آسانی اور خانہ جنگی کے لئے بد نام ہو گئی ہے۔ اور زندگی کے بیشتر شعبوں میں اپنے اہل وطن سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی میں ایک طرف حکومت اور اکثریت کا ہاتھ ہے تو دوسری طرف خود ان کا۔ انیسویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات برطانوی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کے طلسم کے تحت بگڑنے شروع ہو گئے۔ اور ملک کے بٹوارے کے وقت اپنے ابال کو پہنچ گئے۔ ہندوؤں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مسلمان بھارت کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ عداوت کو ان خوں ریزیوں سے شہ ملی جو سرحد کے دونوں طرف ہوتی رہیں۔ ہندوستان میں مسلمان شبہ کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ سرکاری کرمچاریوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں اور فرقہ وارانہ کشت و خوں نے مسلمانوں کو سلامتی کے احساس اور اعتماد سے محروم کر دیا۔ ایسی حالت میں جب جان و مال، عزت و آبرو، سلامتی اور عافیت خطرے میں ہوں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ غریب مسلمان گھٹتے رہے۔ کڑھتے رہے زخم چاٹتے رہے۔ ان کا حوصلہ ٹوٹ گیا، یکسوئی بکھر گئی۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کو جب نوکریاں نہیں ملیں تو انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ روزگار کے دروازے پر دستک دے کر جب وہ نامراد لوٹتے تو بالآخر تنگ آ کر مایوس ہو کر پاکستان کا رخ کرتے۔ وہ جسم اور جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے اور عزت کی زندگی گزارنے کے لئے ترک وطن کرتے تو ان پر تو الزام آتا ہی۔ مسلمانوں کی اس کثیر آبادی پر بھی جس نے کبھی وطن چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا، تہمت دھری جاتی کہ یہ دیش دروہی ہیں۔ وطن کے ساتھ وفاداری سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کا دل پاکستان میں اٹکا ہوا ہے۔ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے۔ ان کا دل حصول علم سے اور اچاٹ ہو گیا۔ اعلا پیشوں جیسے ڈاکٹری، وکالت، انجینیرنگ، اکاونٹینسی، تدریس، صحافت، سائنس، مینجمنٹ، میں امتیاز کے ساتھ داخلہ ان کے خواب و خیال سے دور ہو گیا۔

اس درگت کو دیکھ کر بے دردوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمان قومی دھارا سے الگ ہو گئے ہیں۔ ان میں یہ ہمت بھی نہ رہی کہ جواب میں سوال کرتے کہ "ہمیں قومی دھارا میں داخل ہونے سے روکا کس نے ہے؟ ایک طرف راستہ روکتے ہو، دوسری طرف کہتے ہو کہ رک کیوں گئے۔ اندر کیوں نہیں آتے۔ قومی یکجہتی کی بات کرتے ہو، جہت ہم پر مسدود کرنے کے بعد کہتے ہو کہ ہم نے ملک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یہ بھول جاتے ہو کہ وہ حالات کیا تھے جس نے ہم میں سے کچھ کو اس مطالبہ پر مجبور کر دیا، یہ بھی تمہیں یاد نہیں رہا کہ بٹوارہ تمہارے رہنماؤں کی منظوری سے ہوا اور وہ ہٹ دھرمی جس نے تقسیم کو ناگزیر بنا دیا یک طرفہ نہیں تھی۔ اور دوسری دہائی میں ہی تمہارے یہاں بعض حلقوں میں اس کے امکانات پر

اطمینان کے ساتھ غور ہونے لگا تھا"

لیکن سراسیمگی اور زباں بندی نے مسلمانوں کی قیادت کو یہ سب کچھ کہہ لینے سے روک دیا۔ یہ قیادت سہمی ہوئی اور خوفزدہ تھی۔ ترجمانوں میں جو زیادہ بڑا تھا اس کے دل میں خوف بھی زیادہ تھا۔ یوں بھی مرے پر سو درے لگانے میں جاتا کیا ہے؟ بہر حال ایک ارزاں سکون یہ کہہ کر حاصل ہو ہی جاتا ہے کہ "ہم نے نہ کہا تھا" یا "اگر ہماری بات سنتے تو اس دشا کو نہیں پہونچتے" "زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں کریدنا، خواہ مصلحت وقت کچھ بھی ہو، ہے کام بے دردی کا۔ خوف کے تہ خانے سے جو لوگ ہمت کر کے نکلے وہ مرعوبیت کا شکار ہوئے ان میں دانشوران جامعہ کی وہ تثلیث بھی شامل ہے جس نے ایثار کو شعار بنایا اور گرانقدر تعلیمی خدمات انجام دیں سراسیمگی

مسلمانوں کی اس کثیر آبادی پر بھی جس نے کبھی وطن چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کیا، تہمت دھری جاتی کہ یہ دیش دروہی ہیں۔ وطن کے ساتھ وفاداری سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کا دل پاکستان میں اٹکا ہوا ہے۔

سے مرعوبیت کا سفر کوئی پچیس سال میں طے ہوا۔ یہ تھی قیادت کی بات جو اب پیچھے مڑ کر دیکھئے تو کوتاہ قامت نظر آتی ہے۔ بعض اوقات جب حالات معمول سے ہٹے ہوئے ہوں، تو انسان پیشروؤں کی "روسیاہی" میں اپنی سرخروئی دیکھنے لگتا ہے، دوسروں کی قدح میں اپنی مدح کے پہلو نکال لیتا ہے۔ پرآشوب ایام میں اس وضع کی ترچھی خودستائی کو لوگ اپنے اوپر جائز کر لیتے ہیں۔ اتنے فاصلے کے بعد ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے رہنماؤں نے مسلمانوں کو یک جہتی اور ہم آہنگی کی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں سے خطا کا احساس نکالنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ان میں سے کوئی جیالا کیوں نہیں اٹھا اسباب بغاوت ہند کی طرح اسباب تقسیم ہند لکھنے کیلئے۔ ؟ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیتا۔ دراصل اس سے بڑی غلطی اور ہلاکت آفرینی کوئی نہیں کہ ایک قوم کی نفسیات کو خطا کار بنا دیا جائے۔ لاریب جو خطا ہو اسے تسلیم کیجئے، لیکن دوسروں کی خطاؤں کو بھی اوڑھ لینا کیا ضروری ہے؟۔ اسباب و عوامل کی پیچیدہ کاری سے صرف نظر کیجئے گا تو ہمیشہ غلط نتائج نکالئے گا۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۲ء تک یعنی آزادی کے پچاس سالوں کے نصف اول میں دوہری مار کھائی۔ باہر سے ان پر شبہ اور ظلم ہوا جس نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ اندر سے انہیں یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ انہوں نے اپنے وطن کی سالمیت پر ضرب لگائی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ خارجی حملوں اور داخلی خلفشار نے انہیں اس یکسوئی، ثبات، استقامت، اعتماد، اور غم سے محروم کر دیا جو انہیں خاکستر سے اٹھا کر تعمیر نو کی طرف لے جاتا۔ انہیں ایسے رہنما بھی میسر نہیں ہوئے جو انہیں صحتمند زاویہ نگاہ سے بہرہ ور کرتے اور انہیں جہد و تعمیر کی راہ پر ڈال دیتے، جو ان کی کمزوریوں کو دور کرتے اور ان کی صلاحیتوں کو چمکانے کی سبیل کرتے۔ تقسیم کے بعد کے ابتدائی سالوں میں ہمارے رہنماؤں نے خوفزدہ ہونے کے باوجود سمجھانے اور ڈھارس بندھانے اور افراد کی امداد کرنے اور زیادتیوں پر احتجاج کرنے کا کام اخلاص اور خوش نیتی کے ساتھ انجام دیا۔ اب ہم انہیں اس بات کے لئے الزام کیوں دیں کہ انہوں نے آگے دور تک کیوں نہیں دیکھا اور جرات اور احساس تناسب کے ساتھ بات کیوں نہیں کی۔ یا انہوں نے مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے اس ریزرویشن پر اصرار کیوں نہیں کیا جو کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی نے بطور خود مسلمانوں کے حق میں ضروری سمجھا تھا اور جس کے ساتھ ملازمتوں میں معتدبہ نمائندگی کی ضمانت بھی جڑی ہوئی تھی۔ ہر شخص کی فکر اس کی ہمت کے بہ قدر ہوتی ہے ایسے جانگزا حالات میں حوصلہ پست ہو جاتا ہے، ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس قیادت کو شبہ کا نہ سہی، تاریخی عوامل اور عصری مجبوریوں کا فائدہ دیجئے اور آگے بڑھئے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۹۷۲ء کی حیثیت واٹر شیڈ کی سی ہے۔ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے تو یہاں کے تعلیم یافتہ بے روزگاروں نے سوچنا شروع کر دیا کہ روزی کی تلاش میں سرحد پار کرنے کا سلسلہ اب ختم ہوا۔ آزادی کے بعد کی نسل جوان ہوئی وطن ان کے لئے حد نظر بن گیا۔ اسی کی زمین میں انہیں روزی ڈھونڈنی ہے۔ ڈر، ہیبت اور دہشت کو انہوں نے اپنے دلوں سے نکال دیا۔ چھوٹی تجارت اور چھوٹی صنعت یعنی دوکانداری اور حرفتی پیشے ان کے رفیق بن گئے اور ان کے سایہ میں انہوں نے خوشحالی کی طرف قدم بڑھایا چنانچہ ان کے زحمت کش اور کاریگر جو سرمایہ دار کے دست نگر تھے خود مختاری کا خواب دیکھنے لگے۔ اور ایسے منصوبے کئے کہ جن جن شہروں میں ان کی تجارت اور گھریلو صنعت نے فروغ پانا شروع کیا وہاں فرقہ وارانہ فسادات نے ان کا رستہ کھوٹا کیا۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

آٹھویں دہائی میں فرقہ وارانہ خون آشامی کی لے بہت تیز ہو گئی۔ اس دوران مسلمانوں کی قیادت نے خود غرضی سے مفاہمت حاصل کر لی۔

ہمارے رہنماؤں میں جو بیشتر پستہ قد تھے ،ہمارے مسائل کو سمجھنے کا نہ شعور تھا نہ ان کے حل کے لئے مطالبہ کرنے کی ہمت۔

حالات اور اغیار کے تذکرے کو طول دینے کے بجائے اب ہم یہ ٹٹولنے کی کوشش کریں گے کہ خود مسلمانوں نے کیا کیا۔ ان کا یہ کارنامہ تو اپنی جگہ پر ہے کہ نہ ختم ہونے والی خونریزیوں کے باوجود ان کا پائے ثبات کبھی نہ ڈگمگایا۔ ان کے عوام نے زہرہ شگاف اور جگر دوز مصائب کا سامنا انتہائی دلیری اور بے جگری کے ساتھ کیا۔ انہوں نے اپنی شناخت کو ہر قیمت پر محفوظ رکھا۔ ان کے کھاتہ میں یہی ایک مثبت اندراج ہے جو ہم نے آپ کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے آگے پیچھے منفی اندراجات کے ہجوم سے نگاہ ٹکراتی ہے۔

مصائب سے انہیں مہمیز کا کام لینا تھا جو انہوں نے نہیں کیا۔ حالات نامساعد تھے تو انہیں حریفوں سے کہیں زیادہ محنت کرنی تھی۔ جو انہوں نے نہیں کی۔ اقلیت کی صورت حالات کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ وہ کسب فضیلت کو مقصد زندگی بناتے اور اکثریت سے کہیں زیادہ محنت کرتے ہندوستانی مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے جہد و جہاد، محنت اور ریاضت کوشش اور مسابقت سے اپنے آپ کو دور دور رکھا۔ افرادی طاقت علم اور صحت سے بنتی ہے۔ انہوں نے جہالت کا لبادہ اوڑھ لیا اور صحت کے اصولوں سے انحراف کو اپنی زندگی کا دستور بنا لیا۔ چنانچہ تعلیمی حیثیت سے وہ ہندوستان میں سب سے زیادہ پسماندہ قوم ہیں اور صحت، نظافت اور حفظان صحت سے ان کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔

زمانہ سخت ناموافق ہو تو قومیں اور جماعتیں اپنے اندرونی اختلافات کو بھول جاتی ہیں اور مصیبتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنے اور رکاوٹوں کے پہاڑ سے ترقی اور خوشحالی کی نہر نکالنے کے لئے متحد ہو جاتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے عمل یا بے عملی سے اس کلیہ کو باطل کر دیا۔ انہوں نے ہر قدم پر باہم اختلافات کے لئے مواقع تلاش کئے اور ہر ممکن کوشش کی کہ اختلاف کدورت، نفرت، حقارت، اور عداوت میں بدل جائے۔ شیعہ سنی، آپس میں اس طرح سے لڑتے رہے گویا ان کا تعلق ایک دین سے ہے ہی نہیں۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہ میں دشمن کی حیثیت رکھتے ہیں خدا خدا کر کے کچھ وسیع الخیال روا دار اور دور اندیش علماء کی بدولت یہ شرمناک تفرقہ ختم ہوا۔ (واحسرتا کہ اس اتحاد میں اب پھر شگاف پڑتا دکھائی دے رہا ہے) ایسا لگتا ہے کہ خانہ جنگی ہندوستانی مسلمانوں کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ شیعوں اور سنیوں کو عقل آئی تو مسالک کو باہم وجہ عداوت بنا لیا گیا۔ دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین عداوت نے سر اٹھایا۔ یہ لوگ غیر مسلموں کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے رہے۔ ان تلخیوں اور جھگڑوں سے بھی خانہ جنگی کی پیاس بجھ نہ سکی تو طبقاتی دشمنیوں کو ہوا دی گئی۔ برادریوں نے نام نہاد "اشراف" کے خلاف صف آرائی شروع کر دی۔ الغرض ملت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ اور اسے کفر کی خندہ زنی کا نہ احساس ہوا نہ آبھاس۔ صحت اور تعلیم کے علاوہ کسی قوم کی افرادی طاقت، یقین (ایمان) تنظیم اور اتحاد سے بنتی ہے۔ تنظیم سے ہماری یاد اللہ بھی نہیں ہم جو کام کرتے ہیں وہ بد نظمی اور بے ترتیبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اینٹھی ہوئی گردنیں ہمیں مل کر کام کرنے نہیں دیتیں۔ ادارے جو کسی قوم کی تنظیم اصلاح اور پیش رفت کا سب سے مؤثر ذریعے ہوتے ہیں انہیں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) ہم نے ڈھنگ سے چلانا سیکھا ہی نہیں۔ ہمارے اسکول اور کالج خانہ جنگیوں کے لئے بد نام ہیں اور یہی ان کے معیار کو چاٹ جاتی ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے تعلیمی ادارے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ طالع آزماؤں، خود غرض اور اخلاص باختہ طالبعلم رہنماؤں، بے لیاقت استادوں اور زمینی مافیا کے مکاید سے مجروح ہوتے رہے ہیں۔ یہ لوگ صالح عناصر اور صحتمند رجحانات کو ابھرنے نہیں دیتے۔

ہمارے پاس کوئی باخبر رائے عامہ بھی نہیں۔ جو بھٹکے ہوئے کو راہ پر لا

بے بس مسلم نوجوانوں کے حصے میں صرف احتجاج آیا ہے

سکے۔ ہمارے بیشتر علماء رفتار زمان سے بے خبر ہیں اور ہمارے نام نہاد دانشور عوام سے بے تعلق ہیں یہ دو دنیاؤں میں رہتے ہیں اور زبان حال سے ایک دو نیم ملت کی خستہ حالی کی کہانی دوہراتے رہتے ہیں۔

ہم نے اسلام کے اعتدال اور توسع سے منحرف ہو کر صنف نسواں کو مجبور معذور اور محروم کر رکھا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارا نصف تقریباً بیکار ہو گیا ہے اور ہمارے بچوں کو اپنے گھر میں نہ باخبری کا ماحول مل پاتا ہے، نہ اچھی تربیت، نہ تعلیمی رہنمائی اور امداد۔

جہاں تک واقعات، حادثات، واردات اور افکار کے تئیں ہمارے عمل کا تعلق ہے، ہم بالعموم جذباتیت اور جلد بازی، مکاری اور سطح گرفتگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ احساس تناسب جو انسان کو اہم اور غیر اہم میں فرق کرنا سکھاتا ہے اور جس کی بدولت وہ بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے ہماری گرفت سے دور ہے۔ ہم اصل کو چھوڑ کر فروعات میں الجھ جاتے ہیں۔

زخم خوردہ ہونے کے باعث ہم شروعات شبہ سے کرتے ہیں اسی لئے ہم میں صالح قیادت ابھر نہیں پاتی اور ہمارے رہنماؤں کو وہ اعتماد میسر نہیں ہوتا جو عوام کی تائید سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات جسے روشنی کی کرن کہئے البتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان ہر چند وہ اس خطہ کے دوسرے باشندوں سے پیچھے ہیں، شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت سی باتوں میں بہتر ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کے رخ اور رویہ کا تعلق ہے ہمارے یہاں دو سروں پر دو جماعتیں ہیں قطبین کا فاصلہ جن کے درمیان حائل ہے۔ ایک اعلا انگریزی تعلیم حاصل کیا ہوا گروہ جو ملت سے دور اور اس کے مفاد و مصالح سے نفور رہنے میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ دوسرا دینی تعلیم کے بعض انتہا پسند فارغین یا معتقدین جو اس بنیادی حقیقت کو یک قلم نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہم کسی اسلامی ملک کے باشندے نہیں ہیں یا ہم اس ملک میں نمایاں اقلیت میں ہیں۔ یا یہ کہ ہماری حکومت کا طویل دور اکثریت کے دلوں میں آج تک چٹکیاں لیتا رہتا ہے، یا یہ کہ اہل وطن نے غلط یا صحیح مسلمانوں کو ہندوستان کے بٹوارے کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا ہے ایسی صورت حال اور ان ساری باتوں کے ہوتے ہوئے اور فرقہ وارانہ فسادات کی خون آشامی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں چاہئے کہ اکثریت کے دلوں میں اپنی تلخ کلامی اور گرم گفتاری سے عداوت کی آگ کو نہ بھڑکائیں۔ ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے مذاہب و مسالک کا احترام کریں۔ آپس میں مل جل کر ہنسی خوشی رہنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم دوسروں کے آستانوں میں اپنا سر جھکائیں یا ان سے جھک کر ملیں یا اپنے حقوق کو خیر اندیشی کی رو میں بھول جائیں۔ بسیار کوشی اور حق طلبی دونوں ہم پر واجب ہیں۔ چاہئے کہ ہم متحد اور منظم ہو کر محنت کریں اور مقابلہ کی دوڑ میں سرفرازی کے ساتھ شریک ہوں۔ ہمارے اندر جہاں جہاں خلیجیں حائل ہو گئی ہیں انہیں پاٹ دیں۔ جو وقت گلہ مندی اور شکوہ سنجی میں صرف کیا جا رہا ہے اسے تعمیری اور فلاحی کاموں میں لگائیں یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو گا جب ہم باہمی اعتماد، ایثار، تالیف قلب اور رواداری کو شعار بنالیں گے۔ □

اندرا گاندھی کے طویل دورِ حکومت میں مسلمانوں کو کیا ملا؟

اے جی نورانی کا احتساب

تلخیص و ترجمانی س۔ احمد

ہندوستانی مسلمانوں کے تئیں اندرا گاندھی کی پالیسی کو پندرہ سال کے عرصہ پر پھیلے ہوئے سخت گیرانہ استحصال سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے جس میں وعدوں کے ڈھیر اور متنظمانہ ملمع کاری کی بھرمار تھی۔ اور یہ دونوں ہی حربے داد نارسیدہ شکایات اور بغیر کسی حل کے چھوڑ دیئے جانے والے مسائل پیدا کرنے اور ان پر پردہ ڈالنے کے لئے گڑھے کانگریس گئے کلچر کا

کانگریس کلچر کا ہندوستان

جب موصوفہ کی پارٹی کے جنرل سکریٹری سی ایم اسٹیفن نے بڑی بیباکی سے 1983ء میں یہ اعلان کیا تھا کہ ہندو کلچر اور کانگریس کلچر کی لے میں کوئی فرق نہیں ہے تو انہوں نے اسٹیفن سے ذرا بھی اختلاف نہیں کیا۔ اور اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کہا اس سے اسٹیفن کے الفاظ کی صداقت سامنے آ گئی۔

"۱۱ نومبر 1983ء میں کروکشیتر کے سنتت سرو وا" ں انہوں نے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا تھا۔ یہ بات کہ اس موقع پر اقلیتوں کو جنم بھومی کے حقوق سے آگاہ کرانے کا خیال ان کے ذہن میں آیا ہوگا اس قلب ماہیت کا عکاس ہے جو ان پر غالب تھی۔ کشمیر کے حوالے سے انہوں نے کہا تھا کہ ایک اور دھرم یدھ کی نوبت لانے کے لئے حالات پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

اس سے چند روز پہلے ۳ نومبر کو انہوں نے آریہ سماج کی ایک تقریب میں شرکت کی تھی "دی ٹیلیگراف" میں سیما مصطفی کی رپورٹ میں ان کی کارکردگی کی پوری تفصیل آئی تھی جس کے مطابق "انہوں (اندرا گاندھی) نے جناب بھودھو سے اتفاق کیا کہ ہماری روایات اور مذہب حملے کی زد پر ہیں "انہوں نے ہندو کا لفظ تو نہیں استعمال کیا لیکن ان سے پہلے کے مقرر کے حوالے نے سامعین کے لئے شک کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ وزیر اعظم ایک ہندو لیڈر کی حیثیت سے بول رہی تھیں۔"

۵ جنوری ۱۹۶۱ء کو نہرو نے کہا تھا "جب اقلیتی فرقے فرقہ پرست ہوں تو آپ اسے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کسی اکثریتی فرقے کی فرقہ واریت قوم پرستی سمجھی جانے کی مستحق ہے۔ انہوں نے ایک بار (۱۱ مئی ۱۹۵۸ء کو) اے آئی سی سی کو بتایا تھا کہ اکثریت کی فرقہ واریت اقلیت کی فرقہ واریت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے

اس وقت تک اندرا گاندھی نہرو کے عقیدے سے بہت دور جا چکی تھیں۔ اکثریتی فرقے کے ذہنوں میں انہوں نے عدم تحفظ کے احساس کا زہر گھولنا شروع کر دیا تھا اور اس کی بنیاد پر انہوں نے ایک انتخابی حکمت عملی کو فروغ دیا۔ جس بزدلانہ جرم کے نتیجے میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہوا اس نے راجیو گاندھی کو اندرا گاندھی کی حکمت عملی کو زیادہ مؤثر طور پر برتنے کا موقع دیا۔ 1984ء میں جس وقت ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی جگ جیون رام نے باآواز بلند کہا تھا "یہ ووٹ ہندو ہندوستان کے لئے ہے ۔۔۔ جس کی بنیاد آنند پور صاحب ریزولیشن کی تکرار اور راجیو گاندھی کی تقریروں میں مسلمانوں کے ذکر سے دانستہ گریز پر ہے۔ بے شک مسلمانوں نے کانگریس (ائی) کو ووٹ دیا لیکن ووٹ کس کے لئے دیا؟ انہیں کانگریس آئی کو ووٹ دینا پڑے گا کیونکہ انہیں اس ملک میں رہنا ہے۔۔"

اندرا گاندھی کی طرف سے مسلمانوں کے لئے اختیار کردہ پالیسیوں نے ان کی حالت زار کو سنوارا کم اور ان کی ابتری اور احساس محرومی کو بڑھایا زیادہ۔ بلکہ ان پالیسیوں نے ایک مصنوعی تاثر یہ قائم کیا کہ مسلمانوں کی رضا جوئی کی جا رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ ان کی شکایات کے ازالہ کی سنجیدہ کوشش کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔

مسلم مفادات کے محافظ کی یہ شبیہ اس کے بعد بھی بہت دنوں تک

قائم رہی جب مسلمان محض ایسا ووٹ بینک بن کر رہ گئے جسے وہ آزادی سے استعمال کر سکیں اور جب ان کے تسلط سے الگ ہو کر مسلمان اپنے حقوق پر اصرار کریں یا ان کی پارٹی کے علاوہ کسی دیگر پارٹی کی حمایت کریں تو ان پر اپنا غصہ بھی دکھا سکیں۔ پورے پندرہ سال کے عرصے میں اندرا گاندھی کی طرف سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی علمبرداری کے دعووں کے باوجود ان کے مقدر میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے برعکس یہ فرقہ سیاسی غفلت کے ہاتھوں جمود کا شکار ہو کر رہ گیا۔

فرقہ وارانہ تشدد

سب سے پہلے فرقہ وارانہ تشدد کے مقابل خالصتا جسمانی بقاء کے بنیادی مسئلے کو لیجئے۔ فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کا اندرا گاندھی کا ریکارڈ حد درجہ مایوس کن رہا ہے یوپی میں بعض بدترین فسادات ۱۹۷۲ء میں ہوئے جس میں وزارت داخلہ کا پورٹ فولیو خود ان کے پاس تھا۔ صحیح معنوں میں یہ واقعات فرقہ وارانہ فسادات نہیں تھے جیسا کہ ۱۵ مارچ ۱۹۷۳ء کو ایک نامہ نگار نے رپورٹ دی تھی " تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ بیشتر حالیہ ترین فسادات میں مسلمانوں پر مظالم اکثریتی فرقے کے افراد نے نہیں بلکہ پولیس نے ڈھائے تھے۔ ان فسادات کو بھڑکانے میں اندرا گاندھی کی طرف سے اس انتہائی عہد کی پامالی کا ہاتھ تھا جو انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیت کے قائم کردہ ادارے کی دستوری حیثیت کی بحالی کے سلسلے میں کیا تھا۔ شکستگی اور پست ہمتی کے احساس سے دوچار مسلم اقلیت نے آزادی کے بعد پہلی بار اپنی ہمت یکجا کر کے سڑکوں پر جلوس نکال کر ایک ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا۔ اور ان کا استقبال پولس کی زیادتیوں سے کیا گیا۔

۱۶ جون ۱۹۷۲ء بروز جمعہ صوبائی سطح پر احتجاجی مظاہروں کا اعلان کیا گیا۔ فیروز آباد اور وارانسی میں فسادات بھڑک اٹھے۔ ۲۷ جولائی ۱۹۷۲ کو جب صوبائی اسمبلی میں ان ہنگاموں پر بحث ہوئی تو دونوں شہروں میں مسلمانوں کو ہونے والے جانی و مالی نقصان کے حوالے سے چرن سنگھ نے کہا تھا کہ وہاں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا کیونکہ نہ تو کسی ہندو کی جان گئی اور نہ کسی کی املاک کو کوئی نقصان ہوا بلکہ یہ پورا جھگڑا حکومت اور مسلم فرقے کے درمیان تھا۔ انہوں نے بجا طور پر اس طرف اشارہ کیا کہ جمہوریت میں مذہبی فرقوں کو کسی مخصوص حکومت کے ان اقدامات کے خلاف احتجاج کرنے کا حق ہے جو انہیں منفی طور پر متاثر کرتے ہوں۔ کانگریس حکومت کا رجحان یہ تھا کہ مسلمان فالتو ہیں اور حکومت کے گلے پڑے رہتے ہیں چرن سنگھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فیروز آباد میں مسلمانوں کے جلسے ہوئے بیشتر گھر تو اس کے قرب و جوار میں ہی واقع تھے اور یہ کہ جیسا کہ وہاں کے مسلمانوں نے انہیں بتایا تھا مسلمانوں کو ہندوؤں سے کوئی شکایت نہیں تھی اور ساری شکایت پی اے سی سے تھی۔ ہندوستان ٹائمز کے ایک نامہ نگار نے ۱۵ اگست ۱۹۷۲ کو اصل معاملہ بہت کھل کر بیان کیا کہ "پی اے سی کے صرف ایک آدمی نے، کہا جاتا ہے کہ "لوٹ کے مال سے پانچ سے چھ ہزار روپئے تک بنائے۔ واقعی یہ سوشلزم کی ایک روشن مثال ہے"

ممبر پارلیمنٹ ایم پی گورے نے ۲۸ اگست کو ایک خط یہ بتاتے ہوئے لکھا کہ فیروز آباد میں ۲۶ افراد مارے گئے تھے۔ "لگتا ہے کہ اس شہر میں مسلم فرقے کو ہر قابل تصور ظلم کا نشانہ بنایا گیا لوٹ مار چاقو زنی ہو یا آتشزنی اور عورتوں کی بے حرمتی اور عصمت دری ہو۔ سب سے زیادہ شرم کی بات یہ ہے کہ امن و قانون کے محافظ ہی مقامی غنڈوں کی مدد سے ان گھناؤنے اعمال میں ملوث ہوئے" اندرا گاندھی نے چرن سنگھ کی بات کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ انسپکٹر جنرل آف پولیس کو ان الزامات میں کوئی صداقت نظر نہیں آئی کہ پولس والوں کے سروں پر خون سوار ہوا تھا۔"

فسادات پر قابو نہیں پایا گیا اور اس کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ۲۱ ستمبر کو دادری میں مسلمانوں کے ۳۵ مکانات جلائے گئے۔ ۱۵ نومبر کو نوناری میں ان کے ۲۷ مکانات مسمار کر دئے گئے۔ ۲۰ دسمبر کو سجنی سکٹ پور میں تقریبا سو

گھر لوٹے گئے اور ۳۴ جلائے گئے۔ اس کے بعد رانی متو (۲۹ دسمبر)، درگاجوت (۲۳ جنوری) گونڈہ (۱۴ فروری) اور بستی میں فسادات ہوئے۔ مئی ۱۹۷۳ء میں خود دہلی کے صدر بازار میں فساد ہوا۔

آگے چل کر اس بات کے کافی ثبوت فراہم ہوئے کہ ایمرجنسی کے دوران ظلم و زیادتی کے واقعات کا اندرا گاندھی کو پوری طرح علم تھا۔ لیکن انہوں نے ایسے واقعات میں ملوث تمام افراد کو معاف کر دیا۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۶ء کو سبھدرا جوشی نے اندرا گاندھی کو لکھا تھا:

"جامع مسجد اور ترکمان گیٹ پر جو کچھ ہوا بیان کے باہر ہے۔ آپ نے دہلی اور دہلی کے مسلمانوں کو جن کے گھروں کی ہم نے دیکھ بھال کی اور جن کی حفاظت کا آپ نے یقین دلایا تھا، چند افسروں کے ہاتھ میں سونپ دیا کہ اگر آپ کو تمام واقعات کا علم ہو جائے تو آپ خود ان کی نیت اور صداقت پر شبہ کرنے لگیں گی۔"

اندرا گاندھی کے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ۱۹۸۰ء میں مرادآباد کا فساد رونما ہوا جی کے ریڈی پر تو اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ جلیان والا باغ قتل عام کے بعد پہلی بار مرادآباد کے واحد واقعے میں ۱۳۰ افراد کی جانیں ضائع ہوئیں جو ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو عیدالفطر کے دن پیش آیا۔ یوپی کے ایک کیبنٹ منسٹر اے۔ آر نشتر نے ۱۶ اگست کو یہ کہا کہ مرادآباد میں مسلمان پر ہوئی پولس کی زیادتیوں کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

لیکن ۲۸ اگست ۱۹۸۰ء کو اندرا گاندھی نے مرادآباد کے واقعات کو ایک ایسی بڑی سازش کا حصہ قرار دیا جس کا مقصد حکومت کی بنیادوں کو کمزور کرنا تھا"

دوسرے دن کانگریس آئی ورکنگ کمیٹی نے یہ کہا کہ یہ واقعات حکومت کے اختیار و اقتدار سے تصادم کی تیاری کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۸۲ء میں پی اے سی کا دفاع کیا گیا اور اس کے مظالم کے شکار لوگوں کی مذمت کی گئی۔

مرادآباد کے بعد علی گڑھ، الہ آباد، گودھرا، بڑودہ، پونا اور پھلواری شریف، دہلی اور میرٹھ میں فسادات ہوئے اور یہاں تک کہ ۱۹۸۳ء میں آسام میں بھی فساد ہوا۔ میرٹھ کے بعد بھی جہاں پولس کے مظالم کی جانچ کے لئے جسٹس وی آر کرشنا کو مقرر کرنا پڑا اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں میرٹھ میں پولس کے کردار کی عام مذمت پر ۲۴ فروری ۱۹۸۳ء کو ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۸۳ء کو ہردوار میں انہوں نے بہ اصرار یہ کہا کہ جب کانگریس آئی مضبوط تھی تو کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا اور یہ کہ فسادات کے لئے جتنا حکومت ذمہ دار ہے لیکن اعداد شمار کچھ اور ہی داستان سناتے ہیں جو ان کے بیان کی تائید نہیں کرتی۔

عوام کو روزگار کی سہولت

زندہ رہنے کے حق کے بعد جس بات کی اہمیت ہے وہ ہے روزی کمانے کے حق کی۔ کسی ریاست میں روزگار کے یکساں مواقع کی دستیابی پر باقی حقوق کا انحصار ہوتا ہے اور اگر اس حق سے کسی طبقے کو محروم کر دیا جائے تو اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے اندرا گاندھی کے ۱۹۷۱ء کے انتخابی منشور میں ایک غلطی کا اعتراف اور اس کے ازالہ کا وعدہ و یقین شامل تھا۔ اس منشور میں ملازمت کے معاملے میں اقلیتوں کے خلاف جاری امتیازی سلوک کو مٹانے کا عہد کیا گیا تھا۔"

وعدہ کبھی پورا نہ ہو سکا۔ آج بھی پبلک سروسز میں مسلمانوں کی نمائندگی کی صورت حال قابل رحم ہے۔ جنوری ۱۹۸۱ء کے اعداد شمار کے مطابق ۳۸۸۳ آئی اے ایس افسروں میں کل ۱۱۶ اور ۱۰۰۵ آئی پی ایس

۵ جنوری ۱۹۶۱ء کو نہرو نے کہا تھا "جب اقلیتی فرقے فرقہ پرست ہیں تو آپ اسے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کسی اکثریتی فرقے کی فرقہ واریت قوم پرستی سمجھی جانے کی مستحق ہے۔ انہوں نے ایک بار (۱۱ مئی ۱۹۵۸ء کو) اے آئی سی سی کو بتایا تھا کہ اکثریت کی فرقہ واریت اقلیت کی فرقہ واریت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔"

افسروں میں کل ۵۰ مسلمان تھے یعنی کہ بمشکل تین فیصد۔ کلاس ون اکزیکٹو کیڈر کے مرکزی ملازمین کی کل تعداد میں سے صرف ۱،۶۱ فیصد مسلمان تھے جب کہ سرکاری ملازمین میں یہ شرح ۳،۳۳ اور پبلک کارپوریشنوں میں ۳،۹۱ فیصد تھی۔

۱۹۷۳ء میں یہ طے کیا گیا کہ سروسوں میں اقلیتوں کی نمائندگی کے اعداد وشمار نہ تیار کئے جائیں لیکن یہ راز فاش ہو ہی گیا کہ افسران کی جملہ تعداد میں ۲۲ فیصد اور سی آر پی میں ۴،۲ فیصد مسلمان تھے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء تک پورے سنٹرل سکریٹریٹ میں سکریٹری اور اس سے اوپر کے عہدوں پر فائز ۳۰۰ افراد میں سے صرف پانچ مسلمان تھے۔ پبلک سیکٹر کارپوریشنوں اور قومیائے ہوئے بینکوں کے بورڈوں کے لئے نامزدگی میں جس میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کو عام قومی دھارے سے کون الگ رکھ رہا ہے؟

۱۹۷۱ء کے انتخابی الیکشن میں اردو کے سلسلے میں کوتاہی اور اس کے ازالے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا جس کے الفاظ یہ تھے "اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا جس سے اب تک محروم رکھا گیا ہے" اس وقت سے اردو کی حالت زار کو درست کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ اندرا گاندھی کی حکومت نے ۵ مئی ۱۹۷۲ء کو گجرال کمیٹی قائم کی تھی لیکن اس نے جو رپورٹ ۸ مئی ۱۹۷۵ء کو داخل کی اسے دبا دیا گیا۔ یہ رپورٹ جنتا حکومت کے دور میں ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آئی۔

کانگریس آئی کے ممبران قانون ساز اسمبلی نے یوپی میں دس ممبران اسمبلی کو اردو میں حلف لینے سے روکا۔ اندرا گاندھی نے خود وزیر اعلیٰ وی پی سنگھ کو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے سلسلے میں حکم کے نفاذ سے روکا جب کہ اس حکمنامے پر گورنر نے ۲۹ دسمبر ۱۹۸۱ء کو دستخط کر دیئے تھے لیکن اس کے گزٹ ہونے سے پہلے ۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو اسے واپس لے لیا گیا۔ نہ ہی اندرا گاندھی نے ایکسائز منسٹر وسودیو سنگھ سے کوئی باز پرس کی جنھوں نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۴ء کو ایک سرکاری بل کو قانون کی

اندرا گاندھی کے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد ۱۹۸۰ء میں مراد آباد کا فساد رونما ہوا جی کے ریڈی پر تو اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ جلیان والا باغ قتل عام کے بعد پہلی بار مراد آباد کے واحد واقعے میں ۱۳۰ افراد کی جانیں ضائع ہوئیں

حیثیت سے نافذ کرنے کی مخالفت کی تھی۔

اردو کے گھر اتر پردیش میں اس مدت کے دوران ثانوی سطح پر اردو میڈیم سے تعلیم دینے والا ایک اسکول بھی نہیں تھا کیونکہ باقی اسکولوں کو اور انٹرمیڈیٹ بورڈ نے ۱۹۵۲ء میں آٹھویں جماعت کے بعد اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کی اجازت عطا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالات اور ابتر ہو گئے جب ۱۹۸۴ء میں ایک نیا نصاب تعلیم متعارف کرایا گیا جس کے تحت یہ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھے اور کم حوصلگی کا الزام اٹھائے بغیر کوئی طالب علم اردو بطور مضمون نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی آئینی ضمانت محض مذاق بن کر رہ گئی۔ ایسی ضمانتوں کو زیر عمل لانے کے مرکز کے بے پناہ اختیارات بے مصرف پڑے رہ گئے۔

۱۹۷۳ء میں یہ طے کیا گیا کہ سروسوں میں اقلیتوں کی نمائندگی کے اعداد و شمار نہ تیار کئے جائیں لیکن یہ راز فاش ہو ہی گیا کہ افسران کی جملہ تعداد میں ۲،۲ فیصد اور سی آر پی میں ۴،۲ فیصد مسلمان تھے۔

اقلیتی کمیشن

۱۹۸۰ء کے لئے اندرا گاندھی کے منشور میں اقلیتی کمیشن کو مضبوط کرنے اور اسے دستوری حیثیت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن یہ حیثیت اسے نہ ملی۔ اس کے بجائے اس کی درگت یہ بنائی گئی کہ اس کی سالمیت اور خود مختاری کو چیرمین کی حیثیت سے ایم۔ اچ بیگ کا تقرر کر کے مجروح کیا گیا۔

گوپال سنگھ پینل

منشور میں ایک ایسے اعلیٰ اختیاراتی پینل کے تقرر کا بھی وعدہ کیا گیا تھا جو یہ دیکھے کہ کیا اقلیتوں کو حکومت کی مالیاتی اسکیموں کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پینل نے گوپال سنگھ کی سربراہی میں (اقلیتوں سے متعلق) اپنی رپورٹ ۱۴ جون ۱۹۸۳ء کو پیش کر دی تھی جو ۱۹۹۱ء میں نیشنل فرنٹ حکومت کی طرف سے شائع ہوئی۔

عمومی انداز فکر

۱۹۸۰ء میں اندرا گاندھی کے دوبارہ برسر اقتدار آنے پر وراٹ ہندو

سمیلن اور اس جیسی تنظیموں کے فروغ کے ساتھ ساتھ ملک کی فرقہ وارانہ فضا مکدر ہوتی گئی اور اس گراوٹ پر قابو پانے کے لئے انہوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اگست ۱۹۸۲ء میں اپنے امریکہ کے دورے کے دوران انہوں نے نیویارک ٹائمز کے نمائندے جیمز رسٹن کو بتایا کہ بڑی مقدار میں عرب دولت ملک میں آرہی ہے اور انہوں نے حد درجہ غریب لوگوں کو جن میں کے بیشتر ہریجن ہیں تبدیلی مذہب پر رضامند کرنے کے دانستہ کوششیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست طاقتوں کو فروغ ملا ہے۔ جب ایچ این بہوگنا نے پارلیمنٹ میں اس انٹرویو کا ذکر کیا تو حسب سابق محترمہ اس سے منکر ہو گئیں ..... تاہم ملک کے اندر مسلمانوں پر اثر ڈالنے کے لئے غیر ملکی رسوخ آزادانہ طور پر کام میں لائے گئے اور ملکی مقاصد کے لیے مسلم ممالک میں فضا ہموار کی گئی۔ جس کی شہادت ۱۹۸۰ء کے انتخابات کے موقع پر مسلم ممالک کے سفیروں کے ساتھ مشہور عشائیے سے ملتی ہے۔

۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اندرا گاندھی نے مسلم سامعین کی ایک بڑی تعداد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ناوابستہ تحریک کی صدر نشین کی حیثیت سے عراق اور ایران کے درمیان اختلاف کو ختم کرنے کے لیے کوئی پر امن حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش میں وہ دونوں ملکوں سے برابر رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں اسی طرح انہوں نے کشمیر میں اپنی انتخابی مہم کے دوران ۳۱ مئی ۱۹۸۳ کو پاکستان کے ساتھ دوستی کی طرف اشارے کئے تھے اور اس طرح کشمیر کو پورے ملک سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

اندرا گاندھی کے منصوبہ عمل میں مسلمانوں کو آزادانہ شناخت پر اصرار کی اجازت نہیں تھی۔ جو کچھ اندرا گاندھی نے عطا کر دیا وہ انہیں قبول کرنا تھا آنکھ بند کر کے ان کی اور صرف ان کی حمایت کرنی تھی اور حزب مخالف کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دینا تھا۔

شیخ عبداللہ کی قیادت میں مسلم لیڈروں کا ایک وفد ۱۱ اگست ۱۹۷۳ء کو ان سے ملنے کیلئے گیا اس ملاقات نے ان کے نقطہ نظر کو پوری طرح واضح کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ڈیلی گیشن نے یہ بتایا کہ محترمہ نے یہ بتایا ہے کہ مسلم فرقے نے حزب مخالف سے یہ سوچے سمجھے بغیر حمایت مانگی ہے کہ ان پارٹیوں کی پالیسیاں اور مقاصد کیا رہی ہیں۔ وزیر اعظم نے یہ اعتراف کیا کہ ماضی میں مسلم فرقے نے انتخابات میں ان کی حمایت کی تھی اور انہیں اکثریت میں آنے کے قابل بنایا تھا لیکن اس فرقے کے لیڈروں سے انہیں اس انداز کی حمایت نہ مل سکی۔ محترمہ نے علی گڑھ کے مسئلے پر احتجاجی طرز فکر اختیار کرنے کے لئے ان کی مذمت کی اور انہیں آگاہ کیا کہ وہ کسی دباؤ کے آگے جھکنے والی نہیں ہیں۔

اس واقعے کے دس سال بعد ان کی پارٹی کے ایک رکن شاہ نواز خان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوا۔ جولائی ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ کانگریس (آئی) نواز جمعیۃ العلماء نے جنتا حکومت کے خلاف ملک و ملت بچاؤ تحریک" چلانے کا فیصلہ کیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں پر خصوصاً فسادات کے دوران ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے بارے میں قوم کو بیدار کرنا تھا۔ اس نے جولائی اور اکتوبر ۱۹۷۹ء میں اندرا گاندھی کی مکمل حمایت سے دو ستیہ گرہ مہم چلائی۔

جنرل شاہ نواز نے ۲۱ جنوری ۱۹۸۳ کو اس تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے اندرا گاندھی کو تحریری طور پر ان کے انتخابی وعدوں کی یاد دہانی کرائی اس خط میں انہوں نے اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ "۲۱ فروری ۱۹۸۳ تک کوئی اطمینان بخش جواب نہ پانے کی صورت میں ہم اپنی ہم خیال سیکولر طاقتوں کے ساتھ مل کر سول نافرمانی تحریک چلانے پر مجبور ہوں گے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۸۳ کو اندرا گاندھی نے انہیں یہ جواب دیا کہ "تصادم اور انتشار کی فضا کے ذریعے دوسرے فرقوں میں رد عمل بھڑکا کر شاید اقلیتیں خود کو ہی زیادہ نقصان پہنچائیں گی" جنرل صاحب کی اس وضاحت کے بعد محترمہ نے ایک اور خط ۱۰ فروری کو لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ "آپ کے ذہن میں جس طرح کی بھی ستیہ گرہ ہو اور آپ کے نزدیک وہ کتنی ہی پر امن کیوں نہ ہو کانگریس پر براہ راست ضرب تصور کی جائیگی" حال ہی میں منظر عام پر آنے والی فسطائی ہندو

تنظیمیں مسلم فرقہ پرست تنظیموں کے حقیقی یا خیالی خطرے کا ردعمل ہیں۔
ہم ان سے اسی وقت نبرد آزما ہو سکتے ہیں جب ہمیں اقلیتوں کی حمایت حاصل ہو۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایسی کوئی اقلیت اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی جس سے اکثریت سے تعلق رکھنے والے پڑوسی بدظن ہوں۔ ستیہ گرہ کے موقع پر اندرا گاندھی نے ۲۰ فروری ۱۹۸۳ء کو مسلمانوں کی شکایات پر غور کرنے اور ان کے ازالے کی غرض سے مؤثر اقدام کرنے کے لیے ایک اور کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی میں چار مرکزی وزیر شامل تھے یعنی پی سی سیٹھی (چیرمین) این ڈی تیواری، بوٹا سنگھ اور جعفر شریف اور بیگم عابدہ احمد ممبر پارلیمنٹ۔ اس اعلان سے کانگریس (آئی) کی حامی جمعیۃ العلماء ہند کو سول نافرمانی تحریک واپس لینے کا بہانہ ڈھونڈھنے کا موقع فراہم ہو گیا جس کی شروعات کی غیر مؤثر دھمکی اس نے کچھ دن پہلے دی تھی۔

اندرا گاندھی نے تو ۱۹۸۳ء کے سال نو کے آغاز پر کانگریس (آئی) سے تعلق رکھنے والے لیجسلیچروں کے نام یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ مسلمانوں سے متعلق مشترکہ مسائل کے پیش نظر وہ دوسری پارٹیوں سے وابستگی نہ رکھیں۔ یاد رہے کہ ۵ نومبر ۱۹۸۲ء کو بشمول کانگریس (آئی) چوالیس مسلم ممبران پارلیمنٹ نے مسلمانوں کی شکایات کے سلسلے میں ایک میمورنڈم وزیراعظم کو پیش کیا تھا۔ دو ہفتے بعد ۸ نومبر کو ان میں سے بعض ممبران نے وزیراعظم کی طرف سے اس سمت میں کئے گئے اقدام کی تصدیق کے لیے ان سے ملاقات کا وقت لینے کی درخواست کی لیکن انہیں کوئی جواب نہ ملا۔ وہ میمورنڈم ایک ماہ کے بعد شائع ہوا جس پر وہ برافروختہ ہوئیں۔

محفوظ مساجد

مسلم لیڈروں نے ۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو صفدر جنگ مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے اور رضاکارانہ گرفتاری کی دھمکی دی تھی لیکن یکم مارچ کو انہیں ایک نہیں چار مرکزی وزیروں نے ملنے کے لئے طلب کیا گیا۔ "قانون کی خلاف ورزی کی نیت کون رکھتا ہے" وزیر خارجہ پی وی نرسمہا راؤ نے انہیں یقین دلایا۔ ۲ مارچ سکون سے گزر گیا لیکن منسٹروں سے مل کر آنے والوں کے اضطراب کی معقول وجہ تھی۔ انہیں یہ معلوم ہوا کہ یو این آئی کو اسی دن مذکورہ ملاقات کی رپورٹ شائع کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ ۱۲ مارچ کو راجیو گاندھی نے اس پورے معاملے پر ہی پانی پھیر دیا۔ "یہ مسجدیں صرف ایک دن کے لئے کھولی گئیں۔ اس داستان بدنیتی کی بو آتی ہے جو دس سال پہلے کے علی گڑھ کے واقعات کی یاد دلاتی ہے۔

ہندوستانی پولس ایک مسلم نوجوان کو سیکولرازم کا مفہوم بتاتے ہوئے

یہ مسلمانوں کی ہی حمایت تھی جس کے ذریعے اندرا گاندھی نے ۱۹۷۱ء کے لوک سبھا کے فیصلہ کن انتخابات میں زبردست گٹھ جوڑ کو شکست دی تھی۔ ماڈرن ویز کے اندازے کے مطابق مسلمانوں کی خاصی آبادی والے انتخابی علاقوں میں کانگریس کے ووٹوں کی تعداد ۱۹۷۷ء میں ۲۹ فیصد سے ۱۹۸۰ء تک ۳۸ فیصد ہو گئی۔ باوجود اس کے کہ اندرا گاندھی نے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۰ء کے انتخابات کے لئے مسلم لیڈروں سے سودے بازی کا بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھایا اور خسارے میں اگر رہے تو صرف مسلمان۔

آپ نے انبوہ گردی کو جمہوریت کا نام دے رکھا ہے

درحقیقت ملک کی سالمیت اور یک جہتی کی صرف ایک بنیاد ہے، مسلم دشمنی

تحریر: ڈاکٹر عبدالستار (مدراس)

"ہندوستان سب سے بڑی لیکن سب سے کم نمائندگی والی جمہوریت ہے" "سنڈے" میں منی شنکر ایر کا بیان۔

ہندوستان دو قوموں پر مشتمل نہیں ہے جس کے لئے جناح کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ درحقیقت ہندوستان کثیر قومی، کثیر نسلی، کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی ملک ہے۔ گزشتہ پچاس برس کے عرصہ میں اس تعددی سماج کو ایک وحدت کی شکل دینے میں کسی بھی طرح کا دباؤ کام آیا اور نہ ہی رٹے ہوئے بیان اور اس ملک کے باشندوں کو قومی دھارے میں شامل کرسکے۔ بلکہ الٹے اس نے مزید ابتری اور اختلافات کو ہی جنم دیا۔ آج اس ملک کی تمام اہم نسلیں چاہے وہ آریہ ہوں یا دراوڑی منگولائڈ، اور یہاں کی مختلف قومیں اپنا وہ حق مانگ رہی ہیں جسے کیبنٹ مشن پلان کی بنیاد پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تسلیم کیا تھا۔ اور وہ حق ہے ایک حقیقی وفاقی اتحاد کا۔ موجودہ عملاً مرکزیت پسند ریاست پر دباؤ کچھ اس طرح کا ہے کہ بی جے پی بھی آرٹیکل 356 کو ختم کرنے کا وعدہ کررہی ہے۔ جو وفاقیت کی سمت میں اٹھا ہوا قدم ہوگا۔
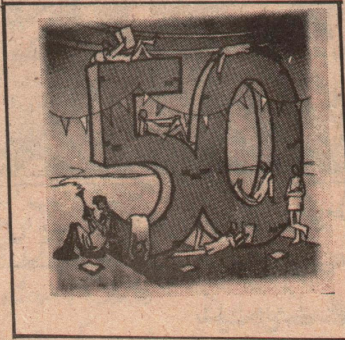
اگر نہرو نے کیبنٹ مشن میں تحریف نہ کی ہوتی تو بشمول ایران وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے بازار ہندوستان کی مٹھی میں ہوتے۔ لیکن تسلط پسند طاقتوں اور رجحانات کو بنیادی طور پر ہندو ہندوستان درکار تھا جو ذات پات کی تفریق میں زیادہ یقین رکھتے تھے اور جو گزشتہ پانچ دہائیوں میں زیادہ متنوع اور منقسم ہوئے ہیں۔ اور اب عملی طور پر، اگرچہ تحریری طور پر نہ سہی، وہ مرحلہ آگیا ہے جس کا خاکہ کیبنٹ مشن پلان میں متعین ہوچکا تھا۔

انتشار پسند طاقتوں پر قابو پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں ایک نمائندہ جمہوریت کی تشکیل کی جائے اس کی بنیاد صرف متناسب نمائندگی اور جداگانہ انتخاب پر رکھی جاسکتی ہے اور جو غیر متوازن اور غیر منطقی انداز میں منڈلیت، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے تحفظ اور ان کے لیے دیگر ذاتوں کی اکثریت والے انتخابی حلقوں کی تخصیص کی شکل میں وجود میں آچکی ہے۔ وفاقیت کے مطالبات کی تکمیل اور اس سے وابستہ توقعات کو تھپکی دینے اور دباؤ دینے کا سب سے زیادہ قابل اعتراض طریقہ مادی اور روحانی زندگی میں تحریری ضابطہ عمل پر سماجی رسوم و عقائد اور اسطوری تصورات کو فوقیت دینے کا ہے۔

اگر تقسیم ملک سے پہلے کے دور میں علیحدہ نمائندگی کی کوئی منطقی اور عملی حیثیت تھی تو آج کیوں نہیں ہوسکتی ہے۔ اگر آج اس کا احیاء پاکستان میں ہوسکتا ہے تو ہندوستان میں ممکن کیوں نہیں ہے۔ کیا منڈلیت اپنے تصور و عمل کے اعتبار سے وفاقیت سے الگ کوئی چیز ہے

کون کس کی نمائندگی کرتا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا تقریباً ناممکن ہے اور یہی سبب ہے جناب منی شنکر کی رائے زنی کا۔ کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ عوام کے نمائندے دراصل سیاسی پارٹیوں کے سرپرستوں کے نمائندے ہوتے ہیں نہ کہ خود پارٹی اور اس کے اصولوں کے۔ غنڈوں کی سرداری اور کسی مخصوص پارٹی کی سرداری میں فرق کیا ہے۔ ان میں سے ایک جوڑ توڑ سے چلتی ہے تو دوسری زور بازو سے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت یا بالفاظ دیگر انبوہ گردی کی عزت انسانی حقوق کے انقلابیوں کے حامیوں نے اتار لی ہے۔

ٹاڈا کی تشکیل بظاہر جمہوری طریقے سے منتخب مجلس یعنی پارلیمنٹ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ اکثریت کی ظالمانہ خواہش تھی جو انسانی حقوق کے انقلابیوں کی نظر میں قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ یہ جنگل کا قانون تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وفاقیت کے علمبردار یعنی دراوڑیوں نے جنہوں نے ہندی کی جم کر مخالفت کی تھی، اور جنہوں نے خود سوزی تک کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ انہی بورڈوں پر تمل زبان میں نام اور ٹریڈ مارک لکھ کر کوئی مختلف کام نہیں کر رہے ہیں جن پر ہندی میں لکھے گئے الفاظ پر کول تار پھیر اگیا ہو۔ انسانی حقوق کا تقاضہ یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے نام

اور مخصوص نشانات اپنی زبان میں اور اپنے طریقے پر لکھنے اور چھاپنے کی اجازت ہو۔ چاہے وہ مادری زبان کا استعمال کریں یا علاقائی زبان کا یا کسی غیر ملکی زبان کے دلکش اور خوبصورت الفاظ کام میں لائیں۔

دراوڑیوں کی اسی سر زمین پر مختلف فرقوں، یعنی ہندو، عیسائی اور مسلمان، کی نمائندگی کے گردشی نظام کی بنیاد پر چنائی کے میئروں کے انتخاب کو بھی زیادہ جمہوری بنایا جاسکتا تھا اور موجودہ طریقے سے زیادہ انسانیت پسندانہ ہوسکتا تھا۔ جس کی جگہ انبوہ گردی نے لے لی ہے۔ تعداد کی بنیاد پر میئر کے انتخاب کے نظام نے نام نہاد جمہوریت کے چہرے پر کالک مل دی ہے۔

قوموں کو باہم جوڑنے کا بہت آسان لیکن بھونڈا طریقہ یہ ہے کہ ان کی زبان اور ثقافت چھین لی جائے۔ (مذہب اتنا اہم نہیں ہے جیسا کہ بنگلہ دیش کی مثال سے ظاہر ہے) باوجود اس کے مشرقی پاکستان اور سابق سوویت یونین میں ہمارے دوستوں کے تجربات تلخ رہے ہیں۔ اردو کا معاملہ بھی ایسی ہی مثال پیش کرتا ہے اور وہ بھی نام نہاد جمہوری طریقوں سے منتخب اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی زبان مسلط نہیں کی تھی۔ بلکہ ہندوستان کی تمام قومی زبانوں حتیٰ کہ انگریزی بولنے والوں کو متحد کرنے، آپس میں جوڑنے کے لئے ایک زبان (اردو) کو وجود بخشا تھا۔ اور پھر بھی مسلمانوں کو علیحدگی پسند، انقسامیت پسند اور انتشار پسند سمجھا جاتا ہے۔

سردار پٹیل نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ ان پر یقین رکھیں اور جداگانہ اور متناسب نمائندگی پر اصرار ترک کردیں۔ ہم نے ان پر یقین کیا اور اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ آرٹیکل ۳۱ جو علٰحدہ اور متناسب نمائندگی کے عوض ملا تھا وہ بھی ہمارے بدخواہوں کی نظر میں دھندلا گیا ہے اور اس پر برسر عام اور عدالتوں میں مباحثے اور مکالمے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جن تعلیمی اداروں کو بنانے میں اقلیتوں نے اپنا خون پسینہ بہایا تھا اور اپنی کمائی لگائی تھی ان کا فائدہ بھی اقلیتی فرقے کے طلباء کو نہیں پہنچ سکتا۔

ہم یہ تجویز کیوں نہیں رکھتے کہ اقلیتیں اپنے طلباء کو اقلیتی اداروں میں اپنی آبادی کے تناسب سے داخل کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ اقلیتی طلباء کو ہر صوبے کے تمام تعلیمی اداروں میں ان کے تناسب کے مطابق داخلہ ملے۔ ہمیں یہ بھی مطالبہ کرنا چاہئے کہ 14 سال کی عمر تک ہر فرد کے لیے مفت ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ سب سے بڑی دستوری مجلس یعنی پارلیمنٹ میں سب سے بڑا تماشہ چل رہا ہے۔ کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی جس میں اقلیتی فرقے کے ارکان شامل ہیں اور دیگر ارکان بھی کھلے عام بحث ومکالمہ اور دلیل بازیوں پر خاموش ہیں، کیونکہ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تمام عدالتوں سے اس وضاحت کی تشریح کے لئے کہا گیا ہے کہ اقلیتوں اور ان کے حقوق سے کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی کیا مراد ہے۔

بی جے پی اور اس کے نمایاں ترین لیڈر اٹل بہاری باجپئی کو ہندوستان میں پیدا ہونے والی کوئی بھی صورت حال اقلیتی رنگ سے خالی نظر نہیں آتی اور وہ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے نظر انداز کردیتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو گروی رکھ دیا گیا ہے۔ ایک سیدھی سی مثال اس کی یہ ہے کہ جب کشمیر کے عوام نہرو کے دعوؤں کی یاد دہانی کراتے ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کو خود مسلم ہندوستان میں ان وعدوں کی تکمیل کے نتائج سے خائف کیا جاتا ہے۔ اگر اردو کو اس کا جائز مقام دینے کا مطالبہ کیا جائے تو فرقہ وارانہ تشدد بھڑک اٹھتا ہے یا اس کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے اور مسلمانوں پر انتشار پسندی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ لیکن شمال مشرق میں خاموشی کے ساتھ وہی مقام انگریزی کو دیدیا جاتا ہے۔ کوئی بھی سنگین مسئلہ ہو اس کا رخ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلے کی طرف کردیا جاتا ہے اور وہ مسلمانوں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اٹل جی کی نگاہ میں "اقلیتی رنگ" کی شکل میں مسلمانوں، اردو زبان اور اردو کلچر کا خوف کھڑا کرنے کے علاوہ ہندوستان کے صوبوں کو متحد کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ اقلیت کی غریبی اور ناخواندگی کی شرح دوسروں کے مقابلے میں بڑھتی جارہی ہے اور با اقتدار طبقہ یہ بھول رہا ہے کہ یہ صورت حال آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گی اور پورے سماج کو اپنے شکنجے میں کس لے گی۔

اقلیتوں کو امریکہ کے سیاسی منظر نامے سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور ہندوستان کو صحیح معنوں میں "اقلیتی رنگ" دینا چاہئے۔ جس کا تصور اٹل جی رکھتے ہیں۔ امریکہ کے یہودی اقلیت کی حیثیت سے اتنے متحد ہیں کہ سب پر بھاری پڑ رہے ہیں اور سیاسی پلڑے کو مغربی ایشیا کی طرف جھکا سکتے ہیں یا اس کی طرف سے اٹھا سکتے ہیں وہ آریوں کا سیاسی چارہ بن کر نہیں رہتے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

گرد راہ ؟

تحریر: ڈاکٹر عمر افضل (امریکہ)
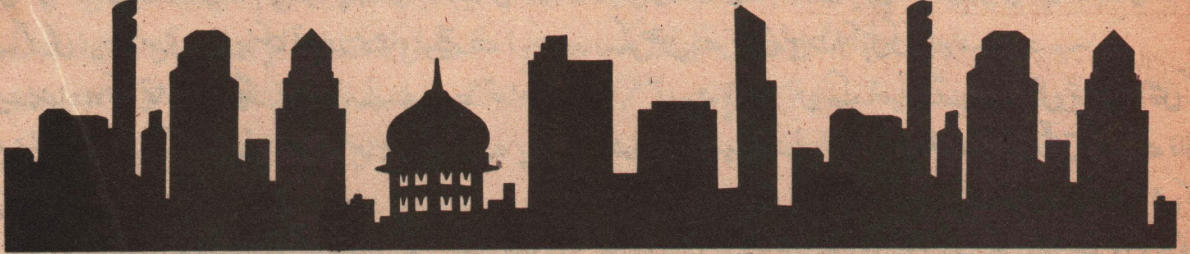
۱۵ اگست ۱۹۹۷ء کو برصغیر کی آزادی کے ۵۰ سال پورے ہو رہے ہیں۔ برطانوی تسلط سے سیاسی آزادی یوں تو برصغیر کے سبھی لوگوں کو ملی تھی مگر آزادی کی یہ صبح مسلمانوں کے لئے بڑی جاں گسل ثابت ہوئی۔ جن کو اسلام اور مسلمانوں کے نام پر ایک آزاد قطعہ زمین مل گیا تاکہ وہ وہاں ایک اسلامی معاشرہ تعمیر کر سکیں وہ پوری تندہی سے اس کو برباد کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ ایک بڑی تعداد جو کسی وجہ سے ہندوستان میں رہ گئی وہ پچاس سالوں کے بعد بھی حیران و پریشان کھڑی ہے کہ منزل کدھر ہے اور راستہ کیوں نہیں ملتا؟ ۱۹۴۷ء میں بھی وہ گرد راہ تھے اور آج بھی ان کی حیثیت گرد راہ سے زیادہ نہیں۔

اہل وطن نے کچھ سال تو انہیں پاکستان بنوانے کے لئے معتوب کیا۔ انہیں پاکستانی ایجنٹ، غدار، وطن دشمن اور غیر وفادار غرض کیا کیا طعنے نہیں دیئے۔ مگر مسلمان خاصے سخت جاں ثابت ہوئے۔ فسادات، معاشی تباہی اور غیر اسلامی روایات کی یلغار کے باوجود وہ ہندوستان میں رہنے پر مصر رہے۔ جاتے بھی تو کہاں؟ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ گذشتہ پانچ دہائیوں میں مسلمانوں نے صرف کھویا ہے پایا کچھ نہیں۔ پیش رفت ہوئی ہے اور مسلمان ساری کوششوں کے باوجود اپنا ملی تشخص برقرار رکھنے میں کسی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

۱۔ تعداد میں اضافہ: اگرچہ بنیادی سبب شرح پیدائش ہے قبول اسلام نہیں مگر چین یا روس کی طرح مسلمانوں کی آبادی کم نہیں ہوئی ہے۔

۲۔ ملی تشخص: مسجدوں میں حاضری، لاکھوں مسلمانوں کی گشت میں مصروفیت، ہزاروں اجتماعات اور کانفرنسوں میں بڑی تعداد میں شمولیت، اسلامی لٹریچر کی اشاعت وغیرہ سبھی کا گراف اوپر ہی جاتا دکھائی دیتا ہے۔ مکاتب اور مدرسوں میں طلباء کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سیکولر تعلیمی اور فنی اداروں میں بھی مسلمان نام کے طلباء بڑھ رہے ہیں۔ سرکاری عہدوں پر صدر جمہوریہ اور نائب صدر سے لیکر وزراء کی فہرست میں چند مسلمان نظر آتے ہیں۔ فسادات میں کمی ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

۳۔ سیاسی وزن: مسلمانوں کا سیاسی وزن بھی محسوس ہونے لگا ہے۔ بی جے پی جیسی سیاسی پارٹیوں کو احساس ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے یا ان کو مخالف بنا کر مقامی اور مرکزی سیاسی اداروں میں اپنی قیادت قائم کرنے کا ان کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔

دوسری طرف ترازو کے پلڑے میں فنی وزن بڑھتا ہی جا رہا ہے:

۱۔ فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد اور شدت میں کمی ضرور آرہی ہے مگر کشیدگی بدستور باقی ہے۔ نہ اہل وطن نے مسلمانوں کو من حیث المجموع کھلے دل سے قبول کیا ہے اور نہ مسلمانوں نے اپنی روش میں کوئی ایسی تبدیلی کی ہے جس کی وجہ سے ان کا احساس اجنبیت ختم ہو۔

اہل وطن نے کچھ سال تو انہیں پاکستان بنوانے کے لئے معتوب کیا۔ انہیں پاکستانی ایجنٹ، غدار، وطن دشمن اور غیر وفادار غرض کیا کیا طعنے نہیں دیئے۔ مگر مسلمان خاصے سخت جاں ثابت ہوئے۔

۲۔ مغربی اور غیر اسلامی اقدار کے سیلاب نے مسلمانوں کی نئی نسل کو بھی اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جیسا دوسروں کو۔

۳۔ تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔ آپسی ناچاقی اور نااہلیت کی وجہ سے سیاسی وزن بھی کم ہوتا جا رہا

ہے۔صرف منفی اقدام سے حاصل کردہ نتائج زیادہ دور رس نہیں ہوسکتے۔

۵۔مسلمان "قومی تشخص" کو نظریاتی تشخص کا متبادل سمجھنے لگے ہیں۔

حل کی بات نہ کیجئے ۱۶۰ کروڑ مسلمانوں کے پاس ۱۶ کروڑ حل ہیں مگر کوئی مڑکر نہیں دیکھتا کہ اس کے مجوزہ حل کا حاصل کیا نکلا ہے اور آئندہ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟

کوئی کہتا ہے کہ مسلمانوں کے دستوری حقوق کو محفوظ کرانے کی مہم چلائی جائے۔کوئی ۶ نکات اور گشت کو حل قرار دیتا ہے۔کسی کو ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب سے دلچسپی ہے اور کوئی نشستوں کے محفوظ کرنے کو سارے مسائل کا حل قرار دیتا ہے۔کچھ لوگ "اسلامی معاشرہ" قائم کرنے کی بات کرتے ہیں اور کچھ "خلافت" کے احیاء کی۔کچھ قومی کاموں کو بھاڑ میں جھونکنے کی بات کرکے صرف اصولی باتیں کرنے تک محدود رہنا چاہتے ہیں، کچھ کا ہدف مراعات کا حصول ہے اور کچھ کے لئے سیاسی تگ و دو کفر۔کچھ معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں ہیں اور چند کو معاشی وسائل کی فراہمی کی فکر۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی چیز بھی بذات خود غلط نہیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی مہم کا ایک اہم جزو ہے۔ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔مگر جس طرح ماضی میں ہم نے کسی ایک پہلو کو کل مسئلہ سمجھنے کی غلطی کی تھی وہی اب دہرانا نہ صرف حماقت ہے بلکہ خودکشی کے مترادف۔

اگر ہم گردراہ نہیں بنے رہنا چاہتے تو ہمیں چند فیصلے کرنے ہوں گے اور ان پر ثابت قدمی سے عمل۔

۱۔مسلم لیڈر شپ میں "انا ولاغیری" کا شعوری یا غیر شعوری احساس اتنا جڑ پکڑ چکا ہے کہ اسکو اکھاڑ پھینکنا تقریبا ناممکن ہوگیا ہے۔مجلس مشاورت اور ایسی ہی دوسری کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔کیا دوبارہ اجتماعی قیادت، کا تصور ابھر سکتا ہے؟

۲۔نعرہ بازی کے بجائے ایک ہمہ جہتی پروگرام، کارکردگی کا قدم بہ قدم منصوبہ، مختلف تنظیموں میں تقسیم کار اور مقررہ مدت پر محاسبہ۔

۳۔"خلافت" کا نعرہ ہے تو بہت پسندیدہ مگر جس طرح حکومت الہیہ، کا نعرہ غیر مسلموں کے ذہنوں میں مسلمانوں کی غلامی کا تصور پیدا کرتا ہے اسی طرح خلافت، کا لفظ بھی۔احیائے خلافت کا نعرہ مولانا محمد علی لگاکر دیکھ چکے۔نہ مسلمان ہی ان کے گرد جمع ہوئے اور نہ ہی غیر مسلموں کو اس پر مطمئن کیا

پچاس برسوں میں دنیا کے مسلمان گردراہ ہی رہے ہیں اور شاید گردراہ ہی رہیں۔اب صرف تعداد کی بنا پر وزن کا خواب خواب گم گشتہ سے زیادہ نہیں۔رسول کہہ گئے ہیں کہ ہماری حیثیت غثاء السیل کی رہ جائے گی اگر ہم نے اپنی اہلیت نہ پہچانی اور اسلام کے زبانی دعووں کو کردار مومن کی جلا نہیں بخشی

جاسکا کہ خلافت سے ان کے مسائل حل ہوسکیں گے۔حکومت الہیہ کا نعرہ بدل کر اصلاح معاشرہ ہوا مگر اس کو ہمہ جہتی کے بجائے وسائل کی کمی اور دوسرے عوامل کی بنا پر بہت محدود کردیا گیا۔

کیا مسلمان "خلافت انسانی" کو اپنا نعرہ بنا سکتے ہیں؟ اللہ تعالی نے انسان کو یہ دنیا سونپی ہے اور وحی کے ذریعہ دو بنیادی تصورات: توحید باری تعالی اور انسانی جوابدہی (آخرت) کی بنیادوں پر عقل اور علم کا استعمال کرکے اس کی اصلاح کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے ہر وہ کام جو اصلاح کے بجائے فساد پر منتج ہو انسان پر غضب الہی کا موجب ہوگا اور خود دنیا میں اس کے مضر اثرات سے بچنا ناممکن ہوگا۔اگر مسلمان، خصوصا برصغیر کے مسلمان اس عالمی، ابدی حقیقت کو عملی شکل نہ دے سکے تو خود ان کی بدقسمتی ہوگی اور دوسروں کی تباہی کا سبب۔
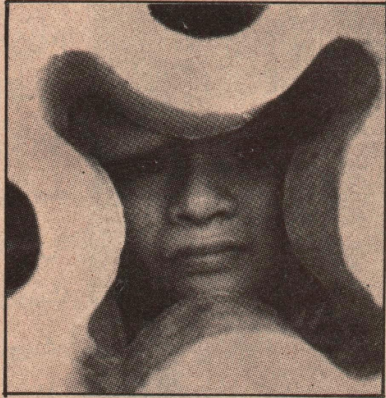
اس خاکے میں عملی رنگ کیسے بھرا جائے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔حالات زمانہ کو پیش نظر رکھ کر کسی بھی نقطہ سے ابتداء کرنی ہوگی۔ورنہ نظریاتی انتشار اور بدعملی ہمیں جہاں تک ڈھکیل کر لاچکی ہے اس کے بعد آگے صرف تباہی کی کھائی ہے اور آخرت کا خسران بھی۔گذشتہ پچاس برسوں میں دنیا کے مسلمان گردراہ ہی رہے ہیں اور شاید گردراہ ہی رہیں۔اب صرف تعداد کی بنا پر وزن کا خواب گم گشتہ سے زیادہ نہیں۔رسول کہہ گئے ہیں کہ ہماری حیثیت غثاء السیل کی رہ جائے گی اگر ہم نے اپنی اہلیت نہ پہچانی اور اسلام کے زبانی دعووں کو کردار مومن کی جلا نہیں بخشی دار الاسلام بلکہ دار السلام بنانے کا خواب وہی دیکھ سکتے ہیں جن کی نظر بلند اور کردار مضبوط ہو۔دوسروں کا گلہ کیوں جب ہم خود ہی آپس میں دست بگریباں ہیں۔کبھی عقیدے کی درستگی کے نام پر اور کبھی صحیح راستہ سے ہٹ جانے کا دوسروں کو الزام دے کر۔ □

تصاویر غیرت

یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

امام الائمہ نرسمہا راؤ جی: امام کانفرنس میں "نائبین رسول" کے ساتھ

نرسمہا راؤ کی حمایت میں علماء و مشائخ کی کانفرنس: شمع محفل ہیں راؤ کے خصوصی معتمد ال کے مشرا جنہیں تصویر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی   یہ کس کافر ادا کا عشوہ خوں ریز ہے ساقی
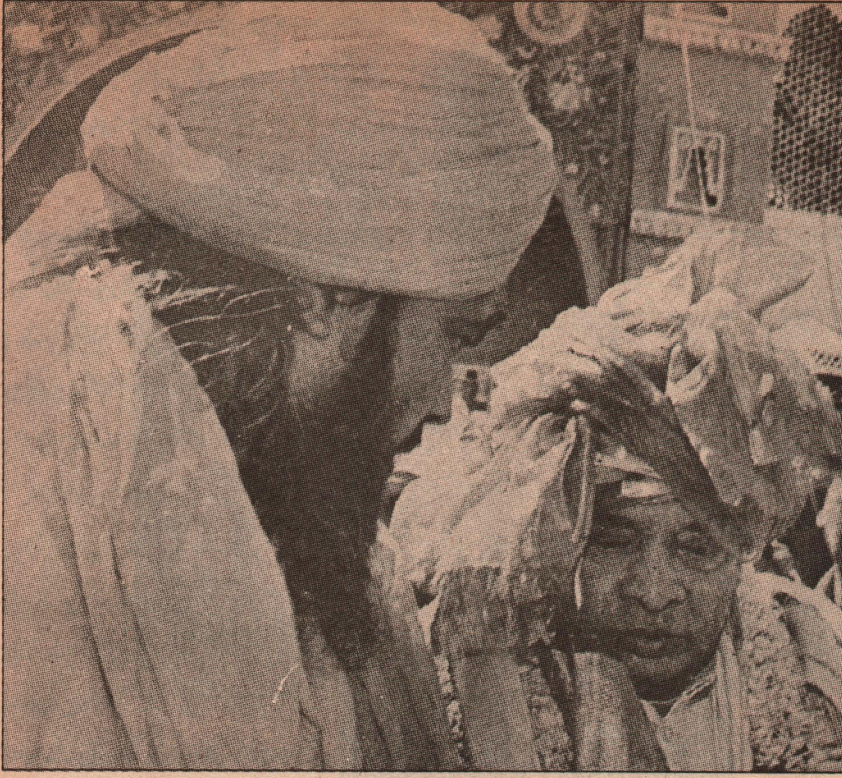
واللہ آپ کو تو
اس فن میں کمال حاصل ہے

اجمیر میں نرسمہا راؤ کو خلعت عطا
کئے جانے کا ایک منظر
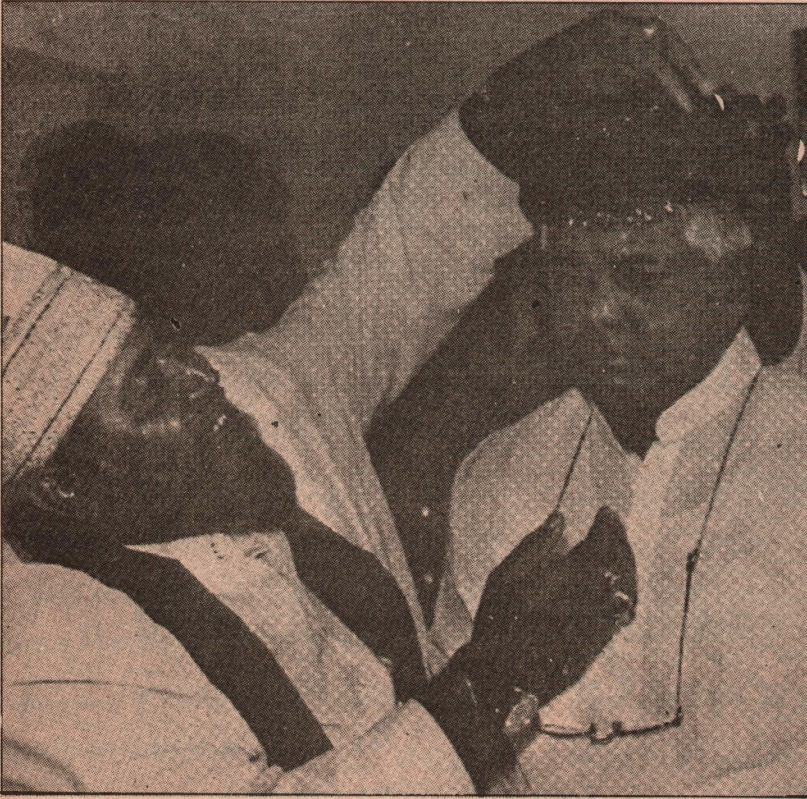
حضرت! اب بس بھی کیجئے۔

تعمیر بابری مسجد کمیٹی کے رکن
افضال نظامی نئی دہلی کی ایک
تقریب میں لالو پرساد یادو کی
دستار بندی کرتے ہوئے
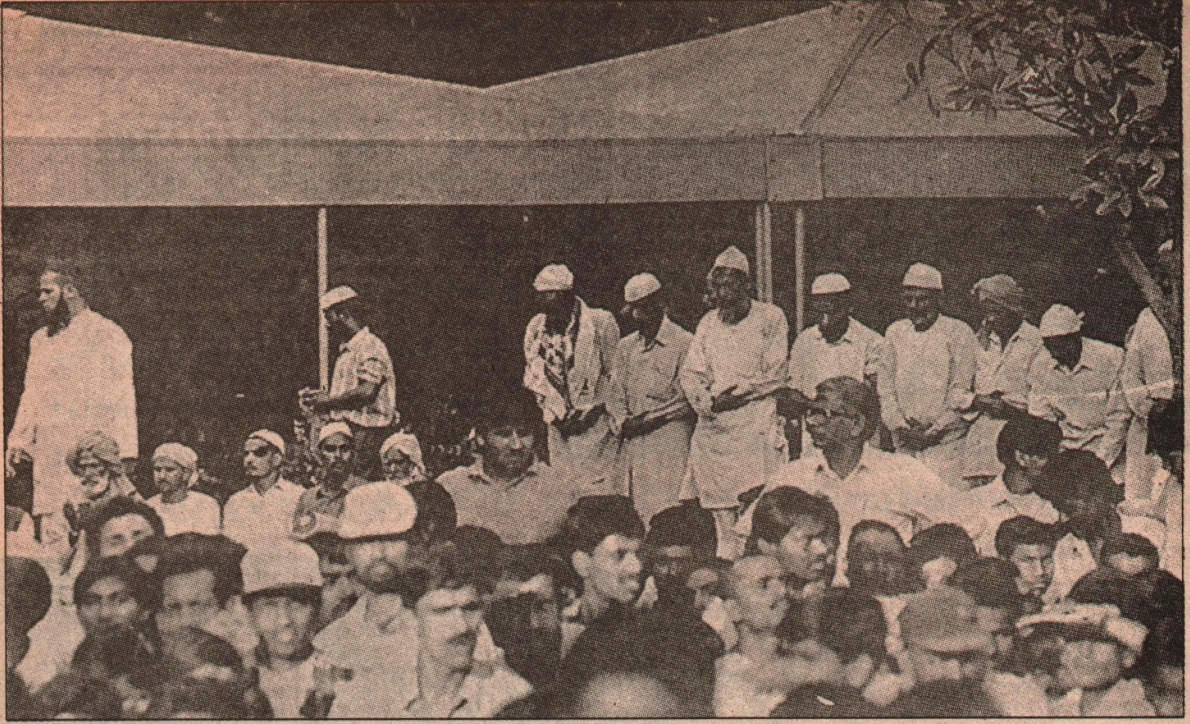
جمعہ کی ایک نماز (سابق) وزیر اعظم راؤجی کے نام
ایام الیکشن میں راؤ کی رہائش گاہ پر نماز جمعہ ادا کرتے ہوئے بے بس اور بے شعور مسلمان

سابق وزیر اعظم راؤ کے آستانے پر علماء کا ایک وفد اس عزم مصمم کے ساتھ کہ
ع تیرے در سے نہ جائیں گے خالی

مسلم خواتین
ہندو احیاء پرستوں کے پارلیمانی رہنما اٹل بہاری باجپئی کو امام ضامن باندھتے ہوئے۔

کہ غیرت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے
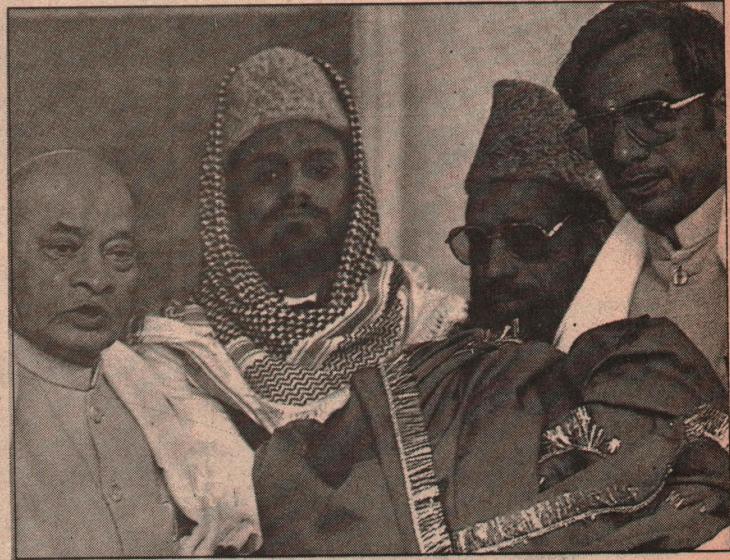
مولانا توصیف رضا خان بریلی شریف میں اعلیٰ حضرت کے ناموس کو نیلام کرتے ہوئے

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرو دلق اویس چادر زہرا

درگاہ حضرت نظام الدین میں موجودہ صدر جمہوریہ کے آر نارائن کی دستار بندی کا ایک منظر

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
حیدر آباد میں مسلم قائدین نظام کفر کے استحکام کے لئے دعا کرتے ہوئے

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حمایت میں علماء و مشائخ اور سجادہ نشینوں کے چہرے کھل اٹھے
واللہ کتنے خوش ہیں آپ سیاسی غلامی کی اس اذیت ناک زندگی پر

دھراوی (بمبئی) میں دسمبر ۱۹۹۲ کے فسادات سے خوف زدہ مسلمان ایک مندر کی تعمیر میں حصہ لیتے ہوئے۔
الہ واحد کے پرستاروں پر قومی یک جہتی کا مفہوم کچھ اس طرح واضح ہوا ہے۔

حضرت! حضرت!
اب رہ ہی کیا گیا ہے؟
تنظیم ائمہ مساجد کے صدر مولانا جمیل الیاسی، راجیش کھنہ کی رہائش گاہ پر ان کی دستار بندی کرتے ہوئے

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک امتی جو اب لالو یادو کے امتیوں میں شامل ہوگیا ہے۔
لالو کا ایجنڈا اس کا ایجنڈا قرار پایا ہے۔
اے کاش کہ یہ ہاتھ لالو کی حمایت کے بجائے محمدؐ کی حمایت میں اٹھتے۔

سابق وزیراعظم وی پی سنگھ اپنے مسلمان امتیوں کے ہمراہ فاروق عبداللہ کو گلے لگاتے ہوئے

رام بھگتوں کا ایک انداز یہ بھی ہے

وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ رام لیلا تقریبات میں علامتی تیر چلاتے ہوئے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف   اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مجسمہ مسیح کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے مسلمان

(جب عیسائی راہبہ ٹریسا کی بحالی صحت کے لئے مشنیریز آف چیریٹی میں ایک بین المذہبی دعائیہ کا اہتمام کیا گیا)

سیکولرازم اور رواداری کی ایک زندہ مثال

گاندھی اور جناح ایک ہی سکے کے دو رخ تھے

پیٹرک فرنچ کی تازہ کتاب میں اہم حقائق پہلی بار منظر عام پر

نام کتاب:	LIBERTY OR DEATH
مصنف:	Patrick French
تلخیص و ترجمانی:	س۔ احمد

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں گاندھی کے قول و عمل کا صحیح علم ہو جائے تو انہیں ہیرو سمجھنے والوں کے ذہنوں سے غلط فہمی دور ہو جائے گی اور وہ ایک بزرگ دانا کے بجائے جذباتی طور پر منتشر سماجی انقلابی اور چالاک سیاسی سوداگر نظر آئیں گے۔ جیسا کہ 1947 میں ہندوستان کے وزیر نقل و حمل جون متھائی نے کہا تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ معاملات حل ہونے کی ناکامی میں کانگریسی قیادت کی گجراتی ذہنیت کا بڑا ہاتھ تھا۔

گاندھی آج بھی ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں عجیب ترین شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ جو سچائی کی پرستش اور چاپلوسی سے نفرت کرتے تھے لیکن ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے بیشتر اقوال ذہن ہلکا کرنے کا ایک ذریعہ تھے نہ کہ کسی نظریے کا اظہار۔ ان کے مخالفین انہی باتوں کو منافقت سے موسوم کرتے تھے اگرچہ بظاہر ان کے اعمال میں سنجیدگی ہوتی تھی۔ ایک برطانوی صوبائی گورنر نے تو انہیں بندروں کی طرح عیار قرار دیا۔ کسی مناسب لائحہ عمل کے بارے میں کوئی شک ہوتا تو وہ اپنے اندر کی آواز سے رجوع کرتے اور دوسروں سے بھی توقع کرتے کہ وہ اس آواز کے احکام سنیں۔
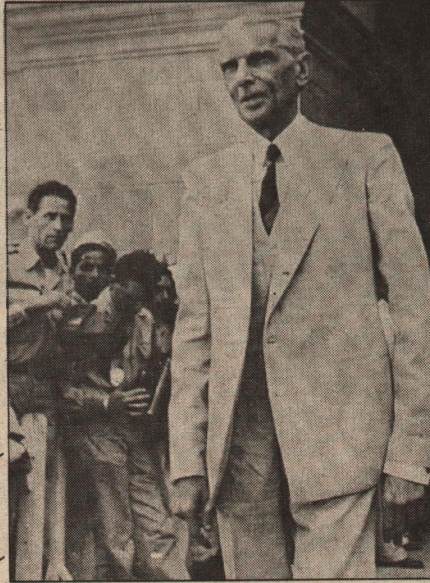
گاندھی جی کی مشہور خود نوشت ان کی خود پسندی کی شاہد ہے اور حق پرستی، سبزی خوری اور اصول غذا جیسے موضوعات پر مبنی یہ کتاب تحریک آزادی ہند کے حقائق میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے فریب کن ہے اور مایوس کن بھی۔ اسے وکٹوریائی طرز کی اخلاقی نصیحت کہا جا سکتا ہے۔ جو نتیجہ ہے مصنف کے اپنے ضمیر سے نبرد آزمائی کا۔ گاندھی کے نزدیک سچائی کبھی اٹل حقیقت نہیں رہی بلکہ یہ ایک سیال تصور تھا جو ان کے ذاتی واہموں اور مقاصد کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اور اس نے انہیں سیاسی سودے بازی میں نقصان بھی پہنچایا۔

سچائی کے ساتھ اپنے تجربات کی روشنی میں وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طائرانہ نظر ڈال کر انہیں ایک جامع نظریے سے مربوط کرنے کی کوشش میں لگ گئے اور مذہب، فلسفہ اور سیاست کو نجی اصول صحت، جنسی تعلقات، اور غذائی نسخوں سے جوڑ دیا، اور عوامی ذاتی اور سیاسی زندگی کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہ گیا۔ گاندھی فریب کاری کے الزام سے بچنے کے لئے اپنے اعمال کو لوگوں پر ظاہر کرتے تھے مثلاً یہ کہ جب منو کے ساتھ سونے کی بات لوگوں کو معلوم ہوئی تو ایک دعائیہ مجمع میں انہوں نے اعلان کیا کہ ان کے معصومانہ اعمال کی غلط تعبیر نہ کی جائے۔ ان کے ساتھ ان کی پوتی رہتی تھی جو ان کے ہی بستر پر سوتی تھی۔

گاندھی کے سکریٹری مہادیو دیسائی کا روز نامچہ خاصا معلوماتی ہے۔ کہیں پر وہ مختلف ذاتوں کے درمیان شادی اور ازدواج بیوگان کی مذمت کرتے ہیں تو چند ہی صفحات بعد شاید ذہنی تھکن دور کرنے کے لئے انہی چیزوں کے فروغ کی بات کرتے ہیں۔ اور بعض معاملات میں تو ان کی منطق سمجھ سے باہر ہے۔ 1919 میں امرتسر کے جلیان والا باغ قتل عام کے بعد انہوں نے یہ شکایت کی کہ "مرنے والے یقیناً "غازی شہید نہیں تھے۔ اگر وہ بہادر ہوتے تو تلوار کھینچ لیتے یا کم از کم لاٹھیاں بھانجتے یا کچھ نہیں تو جب جنرل ڈائر گستاخانہ وہاں آیا تھا تو اس کے سامنے سینہ کھول دیتے اور بہادری سے جان دیدیتے۔ انہیں وہاں سے بھاگنا نہیں پڑتا"

گاندھی کے طرز زندگی میں بڑے تضادات تھے۔ افلاس کو آدرش کا درجہ دینے اور جدید صنعت پسندی کی مذمت کرنے کے باوجود برلا، سارا بھائی اور بجاج خاندانوں کے عطیات پر عیش کرتے رہے۔ ہمیشہ اپنے

عقیدت مندوں کی بھیڑ ساتھ لے کر سفر کرتے ۔ ہندوستان کے دہقانوں کی طرح زندگی گزارنے کا دعوا کرتے تھے ۔ لیکن جہاں بھی جاتے جڑی بوٹیاں، سبزیاں اور صاف ستھری بکری ساتھ رہتی ۔ قدرتی علاج کے طور پر ان کے پیٹ پر ملنے کے لئے مٹی کو ریفریجریٹر میں ٹھنڈا کیا جاتا ۔ اس لئے ایک موقع پر محمد علی جناح نے کہا تھا کہ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے باوجود گاندھی سے کم رقم سفر پر خرچ کرتے ہیں کیونکہ انہیں ایک ہی ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے

گاندھی کی زندگی کا قابل ذکر حصہ انگریزوں کے خلاف لڑنے میں نہیں بلکہ سماجی تبدیلی کے فروغ میں گزرا ۔ انسانی فضلے کو جسے وہ کالا سونا کہتے تھے زرعی پیداوار کی بہتری میں استعمال کرنے کے سلسلے میں ان کے مبسوط نظریات تھے جو قوت شامہ سے محرومی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں ۔ گاندھی کے سوانح نقادوں نے ان کی جن جسمانی دلچسپیوں سے صرف نظر کیا ہے وہ ان کی شخصیت کو سمجھنے میں خاصی اہمیت کی حامل ہیں ۔ مثال کے طور پر وہ دوسروں کے غذائی معمولات اور داخلی صحت کے تئیں تعلق خاطر رکھتے تھے ۔ اور کوئی بھی بیماری ہو اس کے لئے نمک کا رہنما تجویز کرتے تھے اور اپنے جاننے والوں کو یہ انتباہ وہ خود دینا پسند کرتے تھے ۔ اپنے عقیدت مندوں کو جو خطوط انہوں نے لکھے ہو ان جیسے معاملات میں ان کی خاص ہدایات کے مظہر ہیں کہ سیلان الرحم کے لیے نیم گرم پانی میں بیٹھنا بہترین علاج ہے یا اپنی اس طرح خاتون عقیدت مندوں سے روز یہ پوچھنا کہ بہو کیا اس اس صبح آپ کو اجابت کھل کر ہوئی

ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۰۶ میں تجرد کا عہد کرنے بعد انہوں نے جسمانی اتصال کا متبادل مالش اور مسہل کی شکل میں تلاش کر لیا تھا ۔ ودتنا نے اپنی کتاب گاندھی اینڈ ہز ڈسپلس (Gandhi and His Disciples) میں یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ جدید اخلاقی اور سماجی رویوں کے مطالعے کے باوجود اپنے تجربات کے جذباتی اور نفسیاتی مضمرات کے باخبر تھے ۔ ایسی ایک نہیں کئی رپورٹیں ہیں کہ جب ان کے بستر میں شریک یا سفر کے ساتھی لوگوں کو ان سے الگ کر دیئے جانے کا ذرا بھی شبہ ہوتا تو ان پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ ایک بار جب فرائڈ کا یہ نظریہ ان کے سامنے بیان کیا گیا کہ لوگ غیر شعوری خواہشات کے ہاتھوں

گاندھی کے طرز زندگی میں بڑے تضادات تھے ۔ افلاس کو آدرش کا درجہ دینے اور جدید صنعت پسندی کی مذمت کرنے کے باوجود برلا، سارا بھائی اور بجاج خاندانوں کے عطیات پر عیش کرتے رہے ۔

وہ راہ اختیار کرتے ہیں جو وہ شعوری طور پر اختیار نہیں کرنا چاہیں گے تو گاندھی کا جواب تھا کہ فرائڈ کے بارے میں انہوں نے ایک بار سنا تھا ضرور لیکن اس کی کوئی تحریر پڑھی نہیں تھی ۔ انسانی دانائی کا مجسمہ تصور کیے جانے والے شخص سے اپنی ذاتی تحریکات کے تئیں ایسی سرد مہری یقینا تعجب خیز ہے ۔

گاندھی کی خود نوشت میں انہیں ایسے شرمیلے اور خاموش طبیعے نوجوان کے طور پر پیش کرتی ہے ۔ جو لندن میں اپنی رہائش پر بیٹھا محض تین سال تک کو کو کولا پی کر دل بہلاتا رہا حالانکہ اس دوران ان کی کئی لوگوں سے ربط ضبط تھا ۔ وہ وائلن اور ڈانس سیکھنے بھی جاتے تھے ۔ وہاں کوئی کام کرنے کے بجائے انہوں نے مختلف قسم کے لوگوں میں بیٹھ کر بحث مباحثے میں وقت گزارا ۔ افریقہ میں گزرا دور ان کی زندگی کا مؤثر ترین زمنہ تھا جس کے دوران اپنے اندر جو حکمت عملی مرصع کی جو آگے جا کر مقبول ہوئی ۔ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں گاندھی اور کستوربا کے درمیان نظریاتی کشمکش چاروں بچوں کی مناسب تعلیم میں حائل ہوئی ۔ ہری لال چال چلن مثلا شراب نوشی اور جوئے بازی اور قبول اسلام کی دہلیز پر قدم رکھنے سے وہ کافی پریشان تھے ۔ تجرد کی زندی انہوں نے اپنی بیوی کستوربا کو یہ بتاتے ہوئے شروع کی تھی کہ انہیں اس بات پر بڑی ندامت ہوئی تھیکہ ان کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ہو کستوربا کے ساتھ سوئے ہوئے تھے ۔ غرضیکہ قسمت کے تئیں ان کے رجحانات نے انہیں ہمیشہ پریشان رکھا ۔

شملہ کانفرنس: فقیری کی آڑ میں شہنشاہی کی خواہش کا ایک انداز

۱۹۱۵ میں گجراتی مل مالک کے عطیے سے سابر متی آشرم قائم کرنے کے بعد بھی جہاں تربیت خواہوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑوں کے ساتھ ساتھ برہمچریہ پر عمل پیرا لوگ اپنے جنسی تجربات میں مصروف تھے گاندھی کو برطانوی سامراج کے خلوص نیت پر یقین تھا جس کا اندازہ اپنی نسبت قائم

کردہ ہوم رول لیگ اور ان کی طرف سے انگریز مخالف احتجاج کی حمایت سے ان کے انکار سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا جس نسبت! برطانیہ کی طرف سے آپ بدگمان ہیں میں نہیں۔ اور برطانیہ کے خلاف جنگ کے دنوں میں کسی احتجاج میں میں مدد نہیں کروں گا"۔

۱۹۱۸ء میں گاندھی نے دہلی میں جنگ سے متعلق ایک کانفرنس میں وائسرائے لارڈ چلمس فورڈ کے پیش کردہ فوج میں ہندوستانیوں کی بھرتی کی تجویز کی حمایت میں اس مفروضہ پر کی تھی کہ اس سے قوم پرستی کے جذبے کو تقویت ملے گی۔ اور بھرتی کے کام پر جناح کو معمور کیا گیا تھا۔ اپنے ایک خط میں گاندھی نے جناح کو کو لکھا تھا پہلے "آپ رکروٹنگ آفس سنبھالیں، پھر آپ کو ہر منتر ملتی جائے گی"

گاندھی صحافیوں کے درمیان

حقیقت ہے کہ جناح اپنی زندگی کے آخری لمحے تک سیکولرسٹ رہے اور خود پاکستان میں ان کے بابائے قوم کی حیثیت خاص مخدوش رہی ہے۔ تاہم ان کے کارنامے اپنی خامیوں کے باوجود غیر معمولی نہیں ہیں۔ انہں نے لندن میں تعلیم پائی تھا اور ان کا بھی ملنے جلنے والوں کا حلقہ تھا اور مغربی وضع قطع انہوں نے بھی اختیار کی تھی لیکن وہ اپنے ثقافتی روثے کی ظاہری پابندیوں کو ترک کرنے پر انہوں نے کوئی بے چینی نہیں محسوس کی۔ ان کی مغربی جامہ زیبی کی مثال دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آخری زمانے میں ان کے پاس تین سو سوٹ تھے اور جب بھی عدالت جاتے تھے ایک نئی ریشمی ٹائی باندھے ہوئے ہوتے تھے

ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں تجرد کا عہد کرنے بعد انہوں نے جسمانی اتصال کا متبادل مالش اور مسہل کی شکل میں تلاش کر لیا تھا۔

۔ہندوستان واپسی کے بعد نے کامیابی کے ان کے قدم چومے جس میں ان کے کروفر کا بھی ہاتھ تھا اور خصوصا اس نے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں پر ان کا خاصا رعب قائم کر دیا۔

۱۹۰۴ء میں سیاسی تحریک کی تنظیم انڈین نیشنل کانگریس کی میٹنگ میں شرکت کی جہاں انہیں ایک ہونہار نوادر قرار دیا گیا تھا۔ دو ہی سال بعد عمر رسیدہ دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری کی حیثیت سے کلکتہ کے کانگریس اجلاس میں شرکت کی اور اس سے پہلے وہ نہ جھکنے والے لیکن غیر فرقہ پرست سیاست داں کے طور پر شہرت حاصل کر لی تھی۔ کانگریس میں نوروجی اور گوکھلے جیسی مقبولیت پانے کے لئے انہیں مسلمان بننے سے کہیں زیادہ سیکولر بننے کی ضرورت تھی۔

۱۹۱۳ء میں انہوں نے دوسری تنظیم مسلم لیگ اس وضاحت کے ساتھ قائم کی تھی کہ اس سے مراد وسیع تر قومی مقصد سے بے وفائی نہیں اور اس وقت کے کانگریسی انقلابی موتی لال نہرو نے بھی یہی کہا تھا کہ " بیشتر مسلمانوں کے برعکس جناح ہماری ہی طرح پکے قوم پرست ہیں اور وہ انھی قوم کو ہندو مسلم اتحاد کی راہ پر لے جا رہے ہیں۔ اور جناح پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے تک مذہبی اتحاد کے داعی کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے جن کا زور اس پر تھی ہندو مسلم مل کر سامراج کا خاتمہ کریں۔

وہ کانگریس کی بھی اہم شخصیت بنے رہے اور ۱۹۱۳ء میں گوکھلے کے ساتھ لارڈ اسلنگٹن سے میٹنگ کرنے ریاستی انڈر سیکریٹری برائے ہند لیور پول پہنچے تھے اور واپسی پر انہوں نے انڈیا آفس کی برطانوی خزانے سے کفالت کی سنجیدہ تجویز رکھی۔ وہ اس پر بھی بضد تھے کہ ہندوستانیوں کو ہندوستانی فوج میں افسرانہ عہدوں پر مامور کیا جائے کیونکہ ان میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ اس طرح کے اہم آئینی مسائل پر تحریک چلانا ان کا خاص سیاسی طریقہ تھا۔

گجرات میں گاندھی اور جناح کے خاندانوں کے درمیان محض بیس کلومیٹر کے فاصلے کے باوجود کوئی بات انہیں متحد نہ کر سکی۔ وہ دونوں پلی بار ۱۹۱۵ء میں گوجر سبھا کو ایک گارڈن پارٹی میں ملے تھے۔ جناح سوسائٹی کے چیرمین تھے اور ان کی استقبالیہ تقریر کے جواب میں گاندھی نے ایک ایسے مسلمان سے ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا تھا جو نہ صرف ان کے علاقے کی سوسائیٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ اس کا صدر نشین بھی تھا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی برطانوی سیاستداں کسی رفیق کار کے غیر ملکی ہونے کا کھلے عام اظہار کرے اور وہ بھی ایسے موقع پر جہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

اب تک جناح کی شادی بمبئی کے امیر ترین پارسی سوداگر دن شاپیٹیٹ کی اٹھارہ سالہ بیٹی رتن بائی یا رتی سے ہو چکی تھی، اگرچہ دن شا اسے کے خلاف تھے اور اپنے بیرسٹر دوست سے مقدمے بازی بھی کر چکے تھے۔ شادی سے چند روز پہلے رتی کو اسلام قبول کروا کر ان کا نام مریم رکھا گیا ۔جناح سے علحدگی ہونے تک دس سال کے عرصہ میں رتی کا اپنے خاندان

سے کوئی تعلق نہ رہا۔ ان کی پہلی اور اکلوتی اولاد ایک بچی دینا تھا جو ۱۴ اگست ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئی۔

اس وقت جناح چالیس کی حد کو پار کر رہے ہوں گے رتی کو آرائش اور نمائش کا شوق تھا اور اسی نے جناح کو ان کی طرف کھینچا تھا۔ خوبصورت دنے کے ساتھ پارٹیوں میں جانے، فیشن کرنے، نقش ہولڈر سے سگریٹ پینے جیسی عادتوں نے اہیں اور پر کشش بنا دیا تھا۔ تاہم ایک طرح کی نا آسودگی کا احساس بھی جو انہیں اس وقت کے فیشن میں رائج روحانیت کی طرف بھی متوجہ کرتی تھی۔ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کے ایک دعوت میں کچھ زیادہ ہی کھلا ہوا ایوننگ ڈریس انہوں نے پہن رکھا تھا کہ لیڈی ولنگڈن نے سردی لگ جانے کے بہنے خادم سے ایک بڑا اسکارف منگوا کر انہیں باندھ دیا اس کے بعد ان دونوں نے ولنگڈن گھرانے سے کوئی سماجی ربط نہیں رکھا۔

جب بمبئی کے معروف پارسیوں کی طرف سے ولنگڈن کو عام الوداعی پارٹی دی جا رہی تھی ت جناح نے ایک بائیکاٹ کی تنظیم کی جس میں معزز مہاجن اور افیم فروش جمشید جی جی بھائی کی تقریر کے خلاف نعرے لگائے۔ جناح اور ان کے حامیوں کو پولیس کی مدد سے بھگا دیا گیا۔ اور انہیں خود بھی حیرت ہوئی ہوگی کہ وہ بمبئی کی سڑکوں پر ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ چندہ جمع کر کے ان کے نام سے ایک یادگار ہال بھی تعمیر کروایا گیا۔ ہندوستانی قوم پرستی کو تاریخ سے بانی پاکستان کا نام مٹ جانے کے بعد نہ جانے کیوں اسی ہال کو پی جے ہال کہا جانے لگا ہے۔

گاندھی کی ستیہ گرہ کی پہلے پہلے تجویز پر جناح کو شک تھا وہ اپنے آراستہ چیمبر اور مغربی لباس کو کیسے چھوڑ دیتے اپنی سماجی مشترک بنیادوں کے باوجود دونوں لیڈروں میں واضح فرق تھا۔ جناح آئین پسند اور سماجی اشراف پسند تھے ن جنہیں اپنے صاف ستھرے ہاتھوں کو عام لوگوں سے ملا کر گندہ کرنا گوارہ نہ تھا۔ گاندھی کو انہوں نے ایک موقع پر بتایا کہ عدم تعاون کی حکمت عملی خاص طور پر نوجوانوں، جاہلوں اور ناخواندوں کو زیادہ متاثر کرے گی۔ بے شک ان کی بات درست تھی لیکن تحریک آزادی کی ہندوستانی سماج کے نئے سطحوں تک رسائی نے برطانوی حکام کو الٹے پیروں واپسی پر مجبور کیا۔

کلکتہ میں گاندھی کی موت کی خبر سن کر لوگ سڑکوں پر آ گئے

کرسمس ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی کی حکمت عملی عروج بھی تھی کانگریس کی ایک میٹنگ ناگپور میں ہوئی۔ اس کے ممبران کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اور ایک نیا انقلابی ابھر رہا تھا۔ گاندھی نہ صرف ہندؤں میں جوش و خروش پیدا کر رہے تھے بلکہ خلافت تحریک کی حمایت کے راستے سے مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل کر رہے تھے۔ پہلی بار ایک قوم پرست لیڈر نے دونوں فرقوں کے کسانوں اور مزدوروں کو مخاطب کیا تھا۔ ناگپور میں اختیار کی گئی قرارداد کا جس میں گاندھی کی حکمت عملی کی توثیق کی گئی بھی زبردست خیر مقدم ہوا۔ اور اسی کی تیئید کانگریس کے اخراج شدہ ہیرو لالہ لاجپت رائے نے کی۔ جناح نے جو حسب معمول اپنے خیالات پر اٹل تھے۔ اس میٹنگ کے موڈ کی مخالفت کی کیوں نکہ وہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایسی انقلاب پسندی کا کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔ کانگریس کے نئے ہیرو کے لیے ان کے احساسات میں کبھی گرم جوشی نہیں آئی۔ اسی سال کچھ دن پہلے گاندھی نے رتی کو ایک خط لکھ کر جناح کو برہم کر دیا تھا جس میں انہوں نے جناح کی مغربی وضع قطع پر تنقید کرتے ہوئے رتی کو ہدایت دی تھی کہ انہیں ہندوستانی یا گجراتی سیکھنے کی ترغیب دو۔"

جناح کا خیال تھا کہ گاندھی کا طریقہ کار ایک سیاسی تحریک کو بنیادی طور پر ایک روحانی تحرک میں بدل رہا ہے۔ "میٹنگ میں بولنے کے لئے جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تھے تو ان پر "شیم شیم" کی بوچھار ہو رہی تھی اور اپنے حریف کو صرف "مسٹر گاندھی" کے نام سے پکارنے پر ملامت کی تھی۔ مجمع سے آواز آ رہی تھی "مسٹر گاندھی ہیں، مہاتما گاندھی"۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کہیں مذکور نہیں کہ مہاتما نے اس حرکت پر اپنے حامیوں یا چیلوں کو تنبیہ کی ہو۔ اس طرح یہ طے ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کا مبلغ اور معاہدہ لکھنؤ کے مصنف کو کانگریس کی میٹنگ سے نکال باہر کیا گیا۔ جیسا کہ ان کے سوانح نگار نے لکھا: "رتی کے ساتھ اگلی گاڑی سے سنٹرل انڈیا سے رخصت ہوگئے ناگپور میں شکست کی افسردہ یا ان کے ذہن میں برابر لو دے رہی تھیں۔

از نہرو تا گجرال

محرومی کے پچاس سال

تحریر: سید زاہد حسین (دیوبند)

ہند میں اگرچہ مسلمانوں کو ہر طرح کی مراعات اور برابر کے **دستور** حقوق حاصل ہی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آزادی کے بعد دوسرے درجہ کی شہری ہیں۔ ان کی جان و مال عزت و آبرو کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حل ارباب اقتدار کو گاندھیائی فلسفہ "ستیہ و اہنسا" عدم تشدد پر یقین تھا اور جو دنیا کے لئے امن پسندی، فراخ دلی، رواداری، بھائی چارہ کے بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے تھے آج وہی اپنے ملک کی اس ستم زدہ قوم سے سکون و اطمینان اور جینے کا حق چھین لینا چاہتے ہیں۔ اس پچاس ۵۰ سالہ دور آزادی کے ارباب حل و عقد ۱۲ وزیر اعظم کی صورت میں تخت نشین ہوئے لیکن افسوس کے ان سب نے کسی بھی لمحہ عدل و انصاف، مساوات و برادری کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا۔

اس پچاس سالہ دور آزادی میں ارباب حکومت نے اس طبقہ کے ساتھ کس کس طرح غیر مساویانہ امتیاز روا رکھا ہے ان ہزاروں درد بھری داستانوں میں مختصر سا خاکہ بطور نمونہ پیش ہے۔

(۱۹۴۷ء) آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی وزارت کا ابتدائی زمانہ تھا وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمان برابر کے شریک ہیں اور یہ آزادی بنیادی طور پر مسلمانوں کی رہین منت ہے۔ اسی لئے انہوں نے دستور ساز آئین کے تحت سیکولر اور جمہوری روایات کو کسی حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے ہی دور آ میں آر ایس ایس و جن سنگھ جیسی فرقہ پرست تنظیموں کو پولیٹیکل جماعتوں کا درجہ دیکر مسلمانوں کے مدمقابل لاکر کھڑا کر دیا تھا جن کا مقصد مسلمانوں کو ہراساں و خوف زدہ رکھ کر یہ باور کرانا تھا کہ اگر تم نے کانگریس سے راہ فرار کی تو یہ فرقہ پرست جماعتیں تمہارے لئے لقمہ اجل ثابت ہوگی۔ مسلمان بذات خود، ۴۷ء کے خوں ریز حالات سے انتہائی خوف زدہ تھا۔ ایسی خوف و ہراس کے سبب وہ ہمیشہ کانگریس کو آغوش مادر سمجھ کر اس سے چمٹا رہا۔ اس دہشت زدہ مکدر ماحول میں جب کبھی مسلمان نے اپنے حقوق کی بازیابی کی کوشش کی تو در پردہ ان ہی جماعتوں سے سر کوبی کرا کر پھر سے اپنے دامن میں تباہی دے دی۔ اس طرح مسلمان خالصتا یتیموں مسکینوں جیسی زندگی مدت العمر بسر کرتا رہا۔

ان حالات کے تحت ہی اس دور کی کچھ مسلم سنجیدہ باشعور، خود دار ہستیاں یا تو سیاست سے کنارہ کش ہو کر یکسوئی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی تھیں یا کرسی اقتدار کی خاطر کانگریس کی دوغلی پالیسیوں پر دوش بدوش ساتھ رہ کر اپنے ضمیر کا سودا کر چکی تھیں۔ اسی کے نتیجہ میں کانگریسی حکومت ہمیشہ میٹھا زہر بن کر مسلمانوں کا بتدریج استحصال کرتی رہی۔ ایسے مسلم سوداگروں کو تاریخ کبھی معاف نہنی کرے گی۔

مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ خانہ خدا (بابری مسجد) جسکو فرقہ پرستوں نے آئین و انصاف سے بالاتر ہو کر ۶ دسمبر ۹۲ء کو مٹی کے ڈھیر میں بدل کر مندر کا نرمان کر لیا اور کھلے عام ہندوستان کے دستور کو بابری مسجد کے ملبہ میں دفن کر دیا تھا اس قضیہ کا آغاز بھی پنڈت جی کے دور کا ایک تاریخی کارنامہ تھا جو یوپی کی حکومت کی مشترکہ و منظم سازش سے تیار کیا گیا تھا۔

اس حادثہ کا ڈرامائی آغاز اس طرح ہواہ کہ ۲۳ دسمبر ۴۹ء کی ایک تاریک رات میں ایک گھناؤنی سازش کو جنم دیا گیا اور پراسرار طور پر رام

چندر جی کی مورتیاں مسجد میں رکھدی گئی۔ اس زمانہ میں یوپی کے چیف منسٹر گووند ولبھ پنتھ جی تھی۔ مسلمانوں کو علم ہوا تو انہوں نے رپورٹ درج کرادی کہ کچھ شر پسندوں نے چوری سے گھس کر مورتیاں رکھدی ہیں انکو فوراً ہٹایا جائے۔ اس کے نتیجے میں ۳۱ دسمبر ۴۹ء کو ضلع مجسٹریٹ کے ایماء پر قفل بندی کرادی گئی۔ ۱۴۵ کا مقدمہ قائم ہوا۔ اور ۴۳ سال تک تا انہدام مسجد کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اس کے بعد مجسٹریٹ سے استعفی لے لیا گیا۔ اور چند ماہ بعد اس کو لوک سبھا کے لئے نامزد کرلیا گیا تھا۔

اس معاملہ پر شروع سے ہی نا انصافی کی بنیاد پر تنگ و متعصب ذہنیت شامل حال تھی اور پنڈت جی اس میں برابر کے شریک تھے اگر وہ سیکولر ہوتے اور ایک طبقہ کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے تو مسجد سے مورتیاں نکلوا سکتے تھے

پنڈت جی کے بعد گلزاری لال نندا، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی، مرارجی ڈیسائی، چرن سنگھ، مسند وزارت پر جلوہ افروز ہوتے رہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ سب نے ہی کم و بیش دو عملی پیمانہ قائم رکھا۔ یعنی پنڈت جی جو اپنے رہنما اصولوں کو ادھورا چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے پورا کرنیکی کوشش کی۔

کانگریس کے دور حکومت میں دوسرا ۱۵ سالہ طویل دور آنجہانی اندرا گاندھی کا رہا۔ اس وقت بھی مسلمان اکثریت کے ساتھ کانگریس سے چمٹا ہوا تھا۔ محترمہ بھی مسلم طبقہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہیں کہ کانگریس ہی مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ جماعت ہے جو تمام حقوق کی پاسبانی کرتے ہوئے ان کی سچی محافظ ہے۔ چونکہ محترمہ بھی اپنے والد محترم کے دور وزارت کے تمام داؤ پیچ سے بخوبی واقف تھیں اس لئے انہوں نے نہ یہ کہ فرقہ پرست جماعتوں کو ختم کیا بلکہ اس میں مزید تنظیموں کا اضافہ کردیا تاکہ مسلمان ان کے خوف سے راہ فرار اختیار نہ کرلے۔ وشو ہندو پریشد کا قیام بھی ان کی اسی ذہنیت کی عکاسی ہے۔ کبھی کبھی اگر مسلمانوں نے اپنے حقوق کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تو جواب میں فرقہ پرستوں کی جانب سے فرقہ وارانہ فسادات کرادیئے گئے۔ اور یہ بیچارہ ستم رسیدہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کی بیش بندی میں پڑکر تمام ترقیاتی پروگرام بھولتا چلا گیا۔ محترمہ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر فساد کے بعد یہ یقین دہانی ضرور کرادیتی تھیں کہ وہ بہت جلد پولیس و پی اے سی کی بھرتی میں مسلمانوں کو ضرور حصہ دلائیں گی۔ یہ اعلان اعلان کی حد تک رہا اور کبھی اس پر عمل نہ ہوسکا۔

محترمہ کے دور حکومت کا سب سے زیادہ دلخراش حادثہ ۱۹۸۳ء میں مسلمانوں کی مرکزی و دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا فتنہ کھڑا کرنا تھا جس میں انہوں نے اپنے ہمنواؤں سے ساز باز کرکے اس کو دو حصوں میں تقسیم ہی نہیں کرادیا بلکہ علماء کرام اور دانشوران قوم کو بھی تقسیم کردیا اور انہیں بے وزن کرکے حق سے محروم کردیا۔ یہ بھی محترمہ کا ایک تاریخی کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ محترمہ نے ایمر جنسی کا نفاذ کیا تو مسلمانوں کو بے دریغ اس کا شکار بنایا تھا۔ ایک بار تنگ آکر مسلم رہنماؤں نے ان سے شکوہ کیا تو جواب میں برملا فرمایا تھا "میں اکثریت کو ناراض کرکے اقلیت پر باقی نہیں رہ سکتی" یہ تھا محترمہ کا مساویانہ سلوک جس سے مسلمان پورے ۱۵ سال ظلم و تشدد کی چکی میں پستا رہا تھا۔

بالآخر اندرا گاندھی کے عبرت ناک انجام کے بعد پنڈت گھرانے کی موروثی گدی پر ان کے بیٹے "راجیو گاندھی" جلوہ افروز ہوئے۔ انہوں نے پہلا کارنامہ تو یہ انجام دیا کہ ایک طرفہ طور پر عدالت سے ضمنی فیصلہ کرا کے بابری مسجد کا تالا کھلوا دیا اور پوجا شروع کرادی وقف کی زمین پر کھلے عام شیلانیاس بھی کرادیا گیا۔ یکم جنوری ۸۶ء کا یہ فیصلہ ہندوستان کی تاریخ کا بدترین فیصلہ اور کانگریس حکومت کی مسلم دشمنی کا کھلے عام ثبوت تھا۔ اس عمل کو خوفناک اور تباہ کن موڑ اس وقت دیدیا گیا جب اسی رات میں ٹیلی ویژن پر جشن کی صورت میں یہ المناک روح فرساں معاملہ نشر کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں پورا ہندوستان فرقہ وارانہ فسادات میں جل اٹھا آگ اور خون کی ہولی بڑے پیمانہ پر کھیلی گئی۔ چنگیز اور ہلاکو کی ظلم بھری داستان سے بڑھ کر جبر و تشدد بربریت کا بازار گرم کیا گیا اور جانی و مالی طور فرقہ پرستوں کی ہٹ دھرمی کا نذرانہ مسلمانوں کو بلی چڑھا دیا گیا۔ اور ان حالات پر جب کبھی مسلمانوں نے گلہ شکوہ کیا تو ان کا رٹا رٹا

یا صرف ایک جملہ تھا۔ "ہم دیکھ رہے ہیں ہم دیکھیں گے" آخرش ان کا بھی عبرتناک انجام ہوا۔ خدا خدا کر کے ظلمتوں کی شام ختم ہوئی نئی صبح کا سورج طلوع ہوا۔ اس ابھرتے سورج نے پہلی بار، کانگریس کے آہنی پنجہ کو شکست دیکر مسلمانوں کو کانگریس کے "جنگل راج" سے آزاد کرایا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ جب مسلمان مکمل طور سے کانگریس سے بیزار ہو کر وی۔ پی سنگھ کی زیر سرپرستی جنتا دل میں شامل ہوا تھا اس بھرپور اور کاری ضرب پر کانگریس کے ایوان میں زلزلہ طاری تھا۔ ان کے ہاتھوں سے اقتدار بھی چھین گیا تھا۔ اور مسلم طبقہ کا طوق غلامی بھی ٹوٹ چکا تھا۔ ان دگرگوں حالات پر پورا برہمن ازم تلملا اٹھا۔ اس نے فرقہ پرست فسطائی طاقتوں کے غبارے میں ہوا بھرنی شروع کر دی۔ کبھی ایڈوانی کی رتھ یاترا کو فرقہ پرستی کی ہوا دیکئی۔ اور کبھی مرلی منوہر جوشی کی فسادی یاترا کا ڈرامہ رچا گیا۔

۱۹۹۱ء میں ایک ایسی ہستی وزیر اعظم بنکر منظر عام پر آئی کہ جو سفاکی ظلم و بربریت میں جنرل ڈائر کی طرح ہندوستانی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی جس کو، زبانوں پر عبور حاصل تھا جو آر ایس ایس کا ٹریننگ یافتہ اور سیاست کی خلافت بڑے بڑے کہنہ مشق استادوں سے ان کو ورثہ میں ملی تھی انہوں نے جلوہ افروز ہوتے ہی وہ داؤ پیچ دکھا کے گھاگ قسم کے سیاستدانوں کے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ ان کی چالوں میں ایک طرف انسانیت کی دہائی تھی مسلمانوں کے حقوق کی فکر دامنگیر تھی۔ دوسری طرف روز اول سے ہی فرقہ پرستوں سے ساز باز تھا موصوف جس درخت پر بیٹھے تھے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنیکا بھی تہیہ کر چکے تھے۔ ان کے دور وزارت میں ہی تمام فسطائی طاقتوں کو پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ ان کی حکمت عملی جد و جہد نتیجہ میں ہی "کار سوا" کا آخری مرحلہ بھی انجام پا گیا۔ یعنی یہ کہ بابری مسجد رام جنم بھومی" کا جھگڑا جو سیکڑوں سالوں سے درد سر بنا ہوا تھا۔ ان کی بہترین سیاست کے تحت اختتام پذیر ہو گیا۔ اور موصوف بقول شاعر، کارواں اجڑ گیا غبار دیکھتے رہے۔ کی مانند ٹیلیویژن پر اس منور نجن کو دیکھتے رہے تھے۔ موصوف کے بجائے سنوارے مشترکہ منصوبے کے تحت آخرش ۶ دسمبر ۹۲ء کو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں مسجد مسمار کر دی گئی اس پر مسلمانوں نے گھٹ گھٹ کر رونا بھی چاہا تو بزور طاقت ان کی آواز کو گولیوں سے خاموش کر دیا گیا۔ پورے ہندوستان میں اس مظلوم قوم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ وزیر اعظم ہندوستان کے ایسے پختہ کار اور منجھے ہوئے سیاستداں تھے کہ انہوں نے لال قلعہ کے قومی جھنڈے تلے اس سریح جھوٹ کے بولنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا کہ بابری مسجد اسی جگہ دوبارہ تعمیر کی جائے گی۔ "مسجد کی شہادت کے بعد مسلم و غیر مسلم کے درمیان ایسی خلیج پیدا کرادی کہ جس سے ہندوستان کی یکجہتی ہی پامال ہو کر رہ گئی۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کے بعد جگہ جگہ فسادات گرفتاریاں ٹاڈا ایکٹ ظلم و تشدد کا ایسا دور چلا کہ ظلم بھی ظالم کے سامنے شرمسار نظر آنے لگا۔ کانگریس جماعت جو صدیوں سے مستحکم چلی آئی تھی اس کو بھی اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیا اب اس کی بدنصیبی یہ بن چکی تھی کہ اس کے پاس نہ مسلمان کا کوٹہ رہا نہ ہریجن کا۔ اگر کوئی باقی بچا تو وہ صرف فرقہ پرستی تھی۔

۱۹۹۶ء میں تاریکیوں کے بادل چھٹے اور ایک ایسا نام ملک کے وزیر اعظم کے لئے منظر عام پر آیا کہ جس سے خاص طور پر شمالی ہند والے غیر متعارف تھے جس جماعت کے وہ رکن تھے اس سے بھی مسلمانوں کو بہت سی توقعات تھیں۔ چند پارٹیوں پر مشتمل ملی جلی حکومت قائم ہوئی تھی۔ یہ بھی مسلم معاملات کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا طرز عمل بھی سابق حکمرانوں کی مانند رہا۔ انہوں نے بھی رزرویشن سے لے کر اردو کو فروغ دینے۔ فرقہ واریت کو روکنے اور مسلمانوں کے حقوق بحال کرنے کی تمام امیدیں مسلمانوں کو دلائیں تھیں لیکن ان کی یہ پالیسی۔ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔ آخر وقت تک جاری رہی۔ ایک سال کے اندر ہی بیساکھی ان سے کھینچ لی گئی۔ اور یہ بھی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ کے مصداق قعر مزلت میں گم ہو گئے۔

۱۹۹۷ء سے مسٹر اندر کمار گجرال وزارت عظمی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ ان کی حکومت قائم ہو جانیکے بعد ان سے بھی حسب سابق مسلم قائدین کو وہ تمام توقعات ہی جو دیوگوڑا سے تھیں۔ اردو اخبارات بالخصوص مسلم پریس سے ایسا تاثر مل رہا ہے کہ گویا موجودہ وزیر اعظم وہ تمام مسائل یکلخت طے کر دیں گے کہ جن سے ۵۰ برسوں سے یہ قوم دوچار ہے۔ اس لئے تمام مسلم سیاستدان اور اہل دانش نے ان سے وہ توقعات وابستہ کر لی ہیں کہ جن کا ہو جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راؤ اور دیوے گوڑا کی طرح انہوں نے بھی زیر لباس خاکی نیکر زیب تن کر رکھا ہو۔ بظاہر اس قوم کو اس در سے بھی خالی ہاتھ ہی واپس آنا ہوگا۔ اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکے گا۔

ان ناگفتہ بہ حالات کا یہ مختصر سا جائزہ ہے جس سے مسلمان آزادی کے بعد سے آج تک دوچار ہے اور خود کو اپنے وطن عزیز میں ہی غیر محفوظ سمجھنے پر مجبور ہے۔ ایسے غیر یقینی حالات میں آخر ہم اپنے کو کیسے آزاد تصور کر سکتے ہیں۔؟ ہمارا وجود ضرور آزاد ہے مگر فکری، و ذہنی اور تہذیبی یلغار برابر جاری ہے جس سے مسلمان ہر شعبہ زندگی میں مجبور و مفلوج نظر آنے لگا ہے۔

کیا ہندوستان میں کوئی ایسا دن آئیگا کہ جس میں ہر قوم کا فرد اس جشن آزادی کو اپنی آزادی سمجھ کر فرد انبساط کے ساتھ منا سکے گا؟ □

ایام گم گشتہ کے پچاس سال

ایک نظر میں

۱۹۴۰ء کی دہائی

- اگست، ۱۹۴۷ء ملک کی آزادی کے ساتھ بنگال اور بہار کی تقسیم۔ شمالی ہند میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام۔
- اکتوبر، ۱۹۴۷ء کشمیر کے مسئلے پر پہلی ہند۔ پاک جنگ
- دسمبر، ۱۹۴۷ء جائداد متروکہ ایکٹ کا نفاذ ہوا اور مسلمانوں کی املاک پر قبضے کا عدالتوں کو اختیار دیا گیا۔ لکھنؤ میں منعقد ایک کنونشن میں شمالی ہند میں مسلم لیگ توڑ دی گئی اور مدراس پراونشیل لیگ نے اس تنظیم کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔
- جنوری ۱۹۴۸ء ہندو نازی ناتھورام گوڈسے کے ہاتھوں موہن داس کرم چند گاندھی کا قتل
- ستمبر ۱۹۴۸ء حیدرآباد مخالف "آپریشن پولو" حیدرآباد پر ہندوستانی فوجوں کا حملہ، ہندوستان میں اس کے انضمام پر اصرار۔ کانگریس کے اشارے پر ہوئے تشدد میں کئی ہزار معصوم مسلمانوں کی موت۔
- مئی ۱۹۴۹ء مخالفت کے باوجود ہندوستان میں مسلم سیاست کی ریڑھ کی ہڈی یعنی علیحدہ انتخابی حلقوں کا خاتمہ۔ اس سلسلے میں کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں قرارداد پیش کرنے کے لئے بیگم اعزاز رسول کا سردار پٹیل کی طرف سے آمادہ کیا جانا۔
- ستمبر ۱۹۴۹ء حیدرآباد میں جاگیرداری کا خاتمہ۔ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں دیوناگری ہندی کے سرکاری زبان بنائے جانے کا اعلان جس پر اردو، بنگالی اور دراوڑی زبانیں بولنے والوں نے احتجاج کیا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی

- جنوری ۱۹۵۰ء آئین کا نفاذ۔ مسلمانوں کو دوسروں کے مساوی حقوق۔ مسلمانوں کو یکساں سول کوڈ اور گئو کشی سے متعلق آرٹیکل ۴۹ اور ۴۸ قابل اعتراض نظر آئے۔ بہار آفیشیل ایکٹ کے ذریعے ہندی کو بہار کی سرکاری زبان بنایا گیا۔
- اپریل ۱۹۵۰ء وزیراعظم جواہر لال نہرو اور وزیراعظم لیاقت علی خاں نے اقلیتوں سے متعلق ایک معاہدہ پر دستخط کیے اور ہندوستان اور پاکستان پر اپنے حقوق کی تاکید کی۔
- جنوری ۱۹۵۱ء اترپردیش میں زمینداری کا خاتمہ۔ اترپردیش آفیشیل لینگویج ایکٹ کا نفاذ اور ہندی کو واحد سرکاری زبان بنائے جانے کا اعلان
- وقف ایکٹ مجریہ ۱۹۵۴ء کی تشکیل جس میں اوقاف کے مناسب نظم ونسق کے لیے ایک جامع ڈھانچہ تیار کرنے کا منصوبہ رکھا گیا۔
- اگست ۱۹۵۵ء عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کو ہال کیوریٹر ایشور ناتھ ٹوپا کے حکم پر نذر آتش کیا گیا۔
- ۱۹۵۶ء جائداد متروکہ ایکٹ کا خاتمہ
- ۱۹۵۸ء مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال

۱۹۶۰ء کی دہائی

- ۱۹۶۱۔ ۶۳۔ جمشید پور، راوڑ کیلا اور دیگر شہروں میں بڑے پیمانے پر برپا فرقہ وارانہ فسادات میں سیکڑوں مسلمانوں کی شہادت۔
- ۱۹۶۴ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک میٹنگ میں مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل
- ۱۹۶۵ کشمیر کے مسئلے پر ہند۔ پاک جنگ۔ جنگ کے دوران سیکڑوں مسلمانوں کی گرفتاری
- ۱۹۶۷ نظام میر عثمان علی خاں کا انتقال، رانچی، بہار کا قتل عام
- ۱۹۶۹ احمد آباد کا عظیم قتل عام جس میں مسلمانوں کے قتل پر بادشاہ خان نے احتجاجی بھوک ہڑتال کی

۱۹۷۰ء کی دہائی

- ۱۹۷۱ء بنگلہ دیش کے مسئلے پر ہند۔ پاک جنگ کے دوران مسلم لیڈروں کو قید۔ بنگالیوں کے رد عمل کے نتیجے میں ہزاروں بہاری مسلمان بے گھر ہوئے
- ۱۹۷۲ء بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل۔ اردو کے مسائل پر غور کرنے کے لئے آئی۔ کے گجرال کمیٹی کی تشکیل۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۹۷۵ء میں داخل کی جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔
- ۱۹۷۵ء۔ ۱۹۷۷ء اندرا گاندھی کے حکم سے ایمرجنسی کا نفاذ۔ ان کے غنڈوں نے پرانی دہلی میں مسلمانوں کے گھروں پر بل ڈوزر چلائے، مردوں کی نس بندی کی، عورتوں کی عصمت دری کی۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا جس کا نتیجہ پولس کے ہاتھوں ترکمان گیٹ قتل عام کی صورت میں سامنے آیا۔ بعد میں ایک عدالت نے قتل عام میں ملوث ہونے کے الزام میں دہلی ڈولپمنٹ اتھارٹی کے وائس چیرمین جگ موہن کو ماخوذ کیا۔ مظفر نگر، یوپی سے جبری نس بندی کی رپورٹیں ملیں۔
- ۱۹۷۷ء داخلی ایمرجنسی اٹھائی گئی۔ جماعت اسلامی اور آر ایس ایس پر لگائی گئی پابندی ہٹائی گئی۔ قومی انتخابات میں انڈین نیشنل کانگریس کی شکست ہوئی۔ کانگریس کو اتارنے میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔
- ۱۹۷۸ء جنتا حکومت نے اقلیتی کمیشن کی تشکیل کی۔

۱۹۸۰ء کی دہائی

- ۱۹۸۰ء مرآداباد یوپی میں عید الفطر کی نماز کے دوران پراونشیل آرمڈ کانسٹبلری (پی اے سی) کے جوانوں نے ہزاروں مسلمانوں کی جان لی۔
- ۱۹۸۱ء میناکشی پورم، تملناڈو میں ایک ڈرامائی تقریب میں سیکڑوں سابق اچھوتوں نے اسلام قبول کیا۔
- آسام کے نوگاؤں ضلع کے نیلی قصبے میں وحشیانہ تشدد سے معلاب لالنگ قبیلے کے افراد نے پانچ ہزار سے زائد مسلمانوں کا قتل کیا۔
- ۱۹۸۵ء شاہ بانو تنازعہ
- ۱۹۸۶ء ایودھیا (فیض آباد یوپی) عدالت کے حکم سے بابری مسجد کو قبضے میں لے لیا گیا۔ اس وقت سے دسمبر ۱۹۹۲ء تک ملک گیر پیمانے پر احتجاج ہوتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میرٹھ میں پی اے سی نے سیکڑوں نہتے مسلمان نوجوانوں کو ہلاک کر دیا۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل نے اس واقعہ پر ہندوستان کی مذمت کی۔ قانون بسلسلہ تحفظ حقوق طلاق برائے مسلم خواتین کا نفاذ
- ۱۹۸۹ء ہندوستان کے کئی مقامات پر انتخابات کے معاملے میں قتل عام کے واقعات۔ ہندوؤں کے ہجوم کا بابری مسجد کی طرف مارچ جس میں مسجد

کو نقصان پہنچا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی

- ۱۹۹۰ء ہندو جنونی ایل کے اڈوانی کی رتھ یاترا کے نتیجے میں اکتوبر دسمبر میں ملک کے مختلف حصوں میں سیکڑوں مسلمانوں کی ہلاکت۔
- مارچ ۱۹۹۱ء دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کے قومی کنونشن کا انعقاد۔ جس میں ملی پارلیامنٹ کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی۔
- ۱۹۹۱ء اردو کے متعلق علی سردار جعفری کمیٹی کی رپورٹ کا اجراء۔
- ۱۱ جولائی، عبادتگاہوں کے بارے میں خصوصی قانون کی لوک سبھا سے منظوری جس کی رو سے ۱۵ اگست، ۱۹۴۷ء تک عبادت گاہوں کی موجودہ حالت میں تبدیلی ممنوع قرار پائی اور اس طرح مسلمانوں کا ایک دیرینہ مطالبہ پورا ہوا۔
- ۱۹۹۲ء پی وی نرسمہاراؤ کی کانگریس حکومت نے لوک سبھا میں ایک قانون پیش کیا جس میں اقلیتی کمیشن کو قانونی حیثیت دی گئی۔ لوک سبھا نے یہ بل منظور کر دیا۔ صرف بی جے پی واحد پارٹی تھی جس نے اس کی مخالفت کی۔
- ۶ دسمبر کو وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل آر ایس ایس اور بی جے پی پر مشتمل سنگھ پریوار کی قیادت میں شرپسندوں کے ہجوم نے پولس کی آنکھوں کے سامنے بابری مسجد کو پوری طرح منہدم کر دیا۔ پورے ملک میں مسلم مخالف تشدد پھوٹ پڑا۔ ہجوم کے حملوں اور پولس کی فائرنگ میں کئی ہزار مسلمان مارے گئے۔ مسلمانوں اور بابری مسجد کی حفاظت میں حکومت ہند کی ناکامی پر پوری دنیا میں اس کی مذمت کی گئی۔ ایودھیا میں غیر ملکی پریس کے نامہ نگاروں کو جنونی ہندوؤں کے ہجوم نے بری طرح زدوکوب کیا۔ سورت میں مسلم خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی جس کی ویڈیو فلم متعدد مقامات پر دکھائی گئی۔

پولس کے اشارے پر شیو سینا کی طوفانی فوج کے اشتراک سے بمبئی میں مسلمانوں کا منظم قتل عام۔ شیو سینا کے سربراہ بال ٹھاکرے نے کھلے عام اس کی ذمہ داری قبول کی اور نازی جرمن میں یہودیوں کی ایذارسانی کے طرز پر مسلمانوں کا علاج کرنے کا مشورہ دیا۔ مہاراشٹر کی صوبائی حکومت نے شیو سینا یا اس کے سربراہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

- مارچ ۱۹۹۳ء سترہ سلسلہ وار بم دھماکوں نے بمبئی کو ہلا ڈالا جس میں تین سو افراد ہلاک ہوئے۔ پولیس نے میمن برادرز اور غیر ملکی ہاتھ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اگرچہ کوئی ثبوت دستیاب نہ ہو سکا۔
- مئی ۱۹۹۳ء نئی دہلی کے ماؤلنکر ہال میں ملی پارلیامنٹ کے پہلے ملک گیر اجلاس کا انعقاد، جس میں ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت محسوس کی گئی۔
- جون ۱۹۹۳ء آر ایس ایس پر سے پابندی ہٹالی گئی
- نومبر ۱۹۹۳ء یوپی، مدھیہ پردیش، راجستھان اور دہلی میں صوبائی انتخابات مسلم، دلت اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے اختلاط نے یوپی میں بی جے پی کے قدم اکھاڑ دیئے۔ صرف دہلی میں بی جے پی کو کامیابی ملی۔
- مارچ ۱۹۹۴ء سپریم کورٹ نے جماعت اسلامی پر سے پابندی اٹھالی۔
- جنوری ۱۹۹۶ء پٹنہ میں منعقدہ ملی پارلیامنٹ کے سرمائی اجلاس میں مسلم سیاسی بل کی منظوری
- مارچ ۱۹۹۷ء دہلی میں مسلم منشور کا اجراء اور نئی ملک گیر سیاسی پارٹی کے قیام کے بل کو منظوری

بیوی کی ناز برداری کیجئے... مگر اعتدال سے

سوال ثانوی تعلیم سے فراغت کے بعد تین سال تک میں نے کئی طرح کی تجارت میں قسمت آزمائی کی تاکہ اپنا مستقبل سنوار سکوں اور سچ پوچھئے تو یہ میری عملی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی چھوٹی سی تجارت کو بڑھانے کی فکر میں دوڑ دھوپ کرتا رہتا تھا جس کا آغاز صفر سے ہوا تھا یہاں تک کہ اس میں میرے پیر جم گئے۔ اسی دوران میں نے اپنے لئے شریک حیات کا انتخاب کیا اور اس کی اطلاع اپنے گھر والوں کو دی اور ان سے میں نے یہ اصرار بھی کیا کہ شادی کے تمام اخراجات بجائے ان کے میں خود برداشت کروں گا اور چونکہ میں مالی اعتبار سے خوشحال تھا ایسا مجھے کرنا بھی چاہئے تھا۔ خیر شادی کی بات پکی ہو گئی اور کچھ دنوں بعد میں نے اپنی ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے الگ سے آشیانہ تعمیر کیا جو میری بیوی کے لئے اس کی خاص مملکت کی طرح ہو شادی اور تین رات تک خوب دھوم دھام رہی میرے گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر اپنے گھر منتقل ہو گئے۔ اب جو وقت میں نے بیوی کے ساتھ گزارا وہ جہنم کے عذاب سے کم نہ تھا۔ میں نے اسے خوش رکھنے کے تمام ذرائع اختیار کئے لیکن بے سود بلکہ ہماری زندگی روز بروز اجیرن ہوتی گئی۔ اس دوران ہمارے یہاں ایک بچے کی ولادت بھی ہوئی جس سے مجھے یہ امید بندھی کہ یہ ہمارے روابط کو بہتر کرنے کا وسیلہ ثابت ہو گا لیکن ایسا لگتا ہے کہ عورت محبت و انسیت کے احساس سے یکسر عاری ہے۔ اس کا سلوک بچے کے ساتھ تو اور بھی برا ہو گیا اور اس نے یہ بھی خیال نہ کیا اس رویہ کا بچے کی تربیت پر ہر اعتبار سے برا اثر پڑے گا۔

وہ مجھ سے فضول فرمائشیں برابر کرتی رہتی ہے دوسری طرف حال یہ ہے کہ نہ اسے کھانا پکانے آئے نہ گھرداری کا کوئی اور طریقہ پھر بھی میں نے صبر کیا اور باوجود اس کے کہ میرے صبر وضبط کا اسے ذرا بھی لحاظ نہیں ہے میں اس کی حوصلہ افزائی ہی کرتا رہتا ہوں۔ کبھی اس کی طبیعت خراب ہو جائے تو میں اس کی خبر گیری کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے کوئی تکلیف ہو تو پاس نہیں پھٹکتی اور کیا مجال کہ کبھی اسے سونے میں ذرا سی تاخیر ہو جائے۔ میں پوری رات اکیلے جاگ کر کاٹ دیتا ہوں۔ میں نے اسے بہت سی باتوں کا راز دار بھی بنایا اور وہ سب کچھ اپنے گھر والوں کو بتا آئی۔ اس دوران میرے مال و دولت کا خسارہ تو اٹھایا ہی جس کا مجھے غم نہیں ہے کیونکہ تجارت تو نفع و نقصان دونوں کا سودا ہے محبت کی جستجو کی تو نفرت و اذیت ملی، پھول کے بجائے کانٹے ملے۔ کئی بار تو وہ مجھ سے یہ کہہ چکی ہے کہ مرد کو وہ صرف باپ اور بھائی کی شکل میں ہی دیکھنا چاہتی ہے نہ کہ شوہر کے روپ میں حالانکہ شادی کی رضامندی خود اس نے اپنے باپ کی موجودگی میں دی تھی۔ اس صورت حال سے مجھے ڈر ہے کہ میرا بچہ بے گھر در کا ہو کر نہ رہ جائے۔

جواب بھائی! بڑی دکھ بھری کہانی ہے آپ کی دشمن کی آنکھ میں بھی اسے سن کر آنسو آجائیں گے مگر ایسا لگتا ہے کہ شریک حیات کے انتخاب میں آپ نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ ایک حقیقت جو میں آپ کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ عورت کی سرشت میں ہے کہ وہ کمزور مرد کا احترام نہیں کرتی۔ جو لوگ اس پر فریفتگی کی بنا پر اس کی خواہشات کی تکمیل اور اسے مطلوب ہر شئے کی فراہمی کا ذریعہ بن کر رہ جاتے ہیں تو اگر وہ ان کے تئیں احترام کا اظہار کرتی بھی ہے تو میرے خیال میں اس کا مقصد مصلحت پسندی اور مزید مطالبات کی تکمیل ہی ہوتا ہے نہ کہ خالص احترام۔

بعض شوہر یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی خدمت میں خود کو وقف کر دینے سے بیوی بہت خوش رہے گی اور اس کا التفات دوچند ہو جائے گا۔ یہ سوچنے میں وہ غلطی پر تو نہیں ہیں لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے جب کہ زندگی بہت لمبی ہے شوہر کا یہ رویہ بیوی کو اتنا جری بنا دیتا ہے کہ پھر وہ جیسے چاہتی ہے روز مرہ زندگی میں شوہر سے پیش آتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے عورت جذبات کی غلام ہوتی ہے۔ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی زندگی میں اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے۔ یہی جذبات جب اپنی صحیح جگہ پر بروئے کار لائے جاتے ہیں تو محبت و انسیت کی بنیاد پر ایک خوشحال گھر کی تعمیر میں حد درجہ بار آور ثابت ہوتے ہیں اور اگر تنظیم حیات اور مسائل کے سلجھانے کے علاوہ کہیں اور انہی جذبات کا سہارا لیا جائے تو توازن بگڑ جاتا ہے اور یہ عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے اسی لئے بہتر یہی ہے کہ تنظیم حیات اور مسائل کو سلجھانے کا کام عقل وشعور کی بنیاد پر ہو نہ کہ محض جذبات کی بنیاد پر۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نازک معاملات میں آخری فیصلہ مرد کا ہی ہونا چاہئے۔ تاہم اس سے یہ مراد نہیں کہ مرد عورت کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دے اور

باقی: صفحہ ۲۷ پر

شمالی ہند میں مسلم اقلیت کا واحد ادارہ

کٹیہار میڈیکل کالج

قائم شدہ ۱۹۸۷ء

کریم باغ، پوسٹ بکس نمبر ۲۳، کٹیہار، بہار
فون: ۰۶۴۵۲-۲۲۷۱۴
فیکس: ۰۶۴۵۲-۲۳۳۴۹

زیر نگرانی

الکریم ایجوکیشنل ٹرسٹ پٹنہ

اس کالج کو بی۔ این۔ منڈل یونیورسٹی مدھے پورہ، بہار سے مستقل الحاق اور باصلاحیت و تجربہ کار اساتذہ کی خدمات حاصل ہیں۔ مسلم طلباء وطالبات اور کے لئے سیٹیں مخصوص ہیں۔ ۱۰۰ بیڈ کا ہوسپیٹل کام کر رہا ہے اور ۴۰۰ بیڈ کا زیر تعمیر ہے جس کے چھے ماہ میں تیار ہو جانے کی توقع ہے۔

اپیل: کالج کو مزید ہوسپیٹل کی بلڈنگ اور اکیڈمک ونگ کے تعمیر کی فوری ضرورت ہے۔ اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں اور کالج کی کوئی عمارت یا ونگ بنوا دیں۔ وہ عمارت ان کے نام سے منسوب کر دی جائے گی اور ان کے نام کا کتبہ آویزاں کر دیا جائے گا۔

احمد اشفاق کریم
چیرمین و منیجنگ ڈائرکٹر

latter years paved the way for the political supremacy of *Kuffar-o-Mushrekeen.*

(iv) that from Shariah point of view, the idea of India's division was never a valid judgemnet; the Shariah does not allow us to sell off any part of the once Darul Islam even it is to liberate another part of it. As for establishing a separate nation state for Muslims where Allah's commands do not reign supreme, Islam does not recognize any such state, be it Pakistan or whatever. We believe that the present day Pakistan is a deviation from our political tradition. Admitting this deviation, today we Muslims, herebyde-recognise Pakistan as a nation state.

(v) that the Shariah of Allah does not allow us to become upholders or protectors of a system other than Islam. Working as volunteers of secularism, we have committed an unpardonable offence. We, all Muslims of this land, ask forgiveness from our Lord.

The Milli Agenda

We hereby make our intentions known...

(i) that the establishment of a world *Khilafah*, a just system of governance under a rightly guided Imam is our prime objective. According to the Islamic Sariah a true Islamic life can only be achieved in a *Khilafah* system. As long as the world *Khilafah* is not established we Muslims do not have any moment for rest. And since India is abode of largest Muslim population in the world and since the Indian Muslims feel a special emotional attachment with the institution of *Khilafah*, we believe that the Indian Muslims will play a key-role in any future struggle for the revival of *Khilafah*.

(ii) that from *Shariah* standpoint, our status in this country is not that of a minority community rather we are an ideological party. It is our religious obligation to work for the establishment of a just system in this part of the world. As Muslims, we are also obliged to guide the caravan of this country along Quranic lines. Our religion does not allow us to hold any system other than Islamic in reverence.

(iii) that the main target of our political manoeuvering should be to establish an Islamic order. The prophet of Allah has not only taught us how to pray, he has also given us a political philosophy. And as in the political arena too, we have given our allegiance which will be annulled at once if we accept the *kuffar-o-Mushrekeen* as our political boss. Nothing should debar us from respecting this Islamic principle.

(iv) that we are here not to ask for ourselves any special privilege, nor any participation in the political power can quell our restlessness. No scheme for reservations can satisfy us nor any move for educational or economic uplift can bring us a sense of fulfillment. The Islamic *Shariah* demands from us continous struggle till a just system becomes order of the day. This, we believe, is our unfinished agenda.

we willingly accept him as our boss. Speaking from strict Shariah standpoint there is no difference between the two situations. The Islamic verdict on this issue is very clear; that a non-Muslim cannot be made incharge of Muslim's affairs.

The dualism in us has made us so weak from inside that we have almost surrendered to our miserable situation. We have accepted it as our inevitable fate. So much so, now the very idea of a new dawn appears to us an impossible dream. In our milli history, however, such situations have occurred earlier as well. Many a time it appeared to us as if the very flame of our milli life was about to extinguish. But in all such critical moments we organized ourselves and fought back on our own. Then, we were aware of our potential, the real strength of our milli ideology. Today we suffer from a fear psychology, sincerely believing in our minorityness. We want others to protect us. We don't want to do anything on our own. A quick look at the resolutions adopted in our conferences during the last 50 years exposes it well how naively we have been indulging in making a long list of ridiculous demands from the government.

We regard the last 50 years not as a diversion but a clear case of deviation from the Islamic agenda. Probably we never witnessed such an outright deviation in our history before. So complete is the deviation that today our own Islamic agenda appears strange to us. Those working to revive the Ummah with the Islamic agenda are asked if this agenda should rightly be our milli motto, if that be the case, why our Ulema are not speaking up about it. How come you dare to know about the Islamic agenda while our spiritual seers clearly miss this point. Pseudo-ulema with big names and a hallow of false spirituality around their materialistic personality command so much respect that even the Book of Allah fails to create a stir in our thought. Islam as a political ideology has taken a back seat. The situation is much the same what the Quran says: "then is it only a part of the Book that ye believe in, and do ye reject the rest?" (II:85)

Devoid of a clear direction most of our milli efforts end up in utter confusion. What a pity! Even our activists do not know what ultimately they intend to achieve. To take the Ummah from the present impasse everyone offers his own solution, solely relying on his own imagination. Some hold the low literacy rate responsible for our predicament yet there are others who think that a better economy can boost our milli image; some believe that an official guarantee to protect our Personal Laws can make our survival easier while some others feel that working as the loyal agents of *Kuffar-o-Mushrekeen* only can secure us a bright future in this country. The religious scholarship has become a hair-splitting pastime. Our Ulema are busy in settling the issues of marriage and divorce. In some conclaves a new, most modern version of marriage performa is under preparation, while yet another group of the Ulema is soaked in a never-ending discussion to determine the status of currency notes in Islamic Shariah; some are finding new interpretations of Islamic penal code, yet others are busy in producing voluminous books to prove whether stoning to death is Islamic or not. These poor souls are neither aware of the gravity of the situation that Ummah is facing today nor do they have the guts and courage to speak up on vital, life-giving issues. The situation is much the same as it was: when Muslim army entered into Constantinople as conquerors they were amazed to see that, in that critical hour, the Christian Ulema, gathered in one of the magnificent churches, were debating the nature of the bread that was sent down to (prophet) Jesus.

The gravity of this situation demands from us that instead of wasting our energy in superficial measures, our first and foremost priority should be to correct the obvious deviations, thus giving our lost caravan a direction. At this point of history, we believe, it is high time to rediscover our lost agenda. Nothing should de"ar us from making our intentions known. Hence, this *Muslim Manifesto.*

> We believe that the present day Pakistan is a deviation from our political tradition. Admitting this deviation, today we Muslims, herebyde-recognise Pakistan as a nation state.

We realise ...

(i) that our last 50 years 'efforts have been directionless, a deviation from the accepted Islamic norms. We consider this part of our milli history as the Lost Years.

(ii) that despite identifying ourselves with the ideals of Islam our efforts were directed to estalish an alien system in this land. We feel ashamed for this outright violation of the *Shariah.*

(iii) that Maulana Azad's decision to annul the idea of a separate Muslim political party in 1947 Lucknow Convention was a political blunder of unprecedented magnitude which in